جلد ۱۳ اپریل ۱۹٦۷ء شمارہ ۴

# ماہنامہ میثاق لاہور

زیر سرپرستی

مولانا امین احسن اصلاحی

مدیر مسئول

اسرار احمد

یکے از مطبوعات

دار الاشاعت الاسلامیہ

امرت روڈ، کرشن نگر، لاہور - ۱

قیمت فی پرچہ ۷۵ پیسے

# قواعد و ضوابط

*

* ''میثاق'' ہر ماہ کی پانچ تاریخ تک سپرد ڈاک کیا جاتا ہے۔
* پرچہ نہ ملنے کی اطلاع زیادہ سے زیادہ بیس تاریخ تک دفتر کو موصول ہوجانی چاہئے ورنہ دوبارہ پرچہ ارسال نہیں کیا جا سکے گا۔

*

* ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔
* پرچہ صرف بذریعہ وی پی ارسال ہوگا۔
* کمیشن ۲۵ فی صد — محصولڈاک بذمہ میثاق۔

*

ہندوستانی خریدار

مندرجہ ذیل میں سے کسی ایک جگہ رقوم ارسال کرکے ہمیں مطلع فرماویں:

۱۔ دفتر ماہنامہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

۲۔ دائرۂ حمیدیہ، سرائے میر، اعظم گڑھ

*

قیمت فی پرچہ ۷۵ پیسے
سالانہ زرمبادلہ ساڑھے سات روپے
مشرق پاکستان سے بذریعہ ہوائی ڈاک پندرہ روپے

☐ اس جگہ سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ اس شمارے کے ساتھ آپ کا زرمبادلہ ختم ہوچکا ہے — آئندہ کے لئے

* سالانہ زرمبادلہ مبلغ ساڑھے سات روپے بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمادیں — یا
* اگر آپ کسی وجہ سے خریداری جاری رکھنا نہ چاہیں تو ہمیں مطلع فرمادیں ——— ورنہ
* آئندہ شمارہ آپ کو سالانہ زرمبادلہ اور محصولڈاک کی مالیت کا وی پی ارسال ہوگا اور اس کو وصول کرنے کے آپ اخلاقاً ذمہ دار ہوں گے۔

وَقَدْ اَخَذَ مِیْثَاقَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۰

زیرِ سرپرستی
مولانا امین احسن اصلاحی

ماہنامہ

# میثاق

لاہور

مدیر مسئول
اسرار احمد

جلد ۱۳ — اپریل ۱۹۶۷ء — شمارہ ۴


## فہرست


★ تذکرہ و تبصرہ ——— اسرار احمد ۶

★ تدبرِ قرآن ——— مولانا امین احسن اصلاحی

— تفسیر سورۂ نساء (۲) ——— ۹

★ افاداتِ فراہی ———

— ملکوت اور سنۃ اللہ ——— خالد مسعود ۲۵

★ مقالات ———

— رویت ہلال کا مسئلہ ——— خالد مسعود ۳۰

— طلباء سے خطاب ——— مولانا امین احسن اصلاحی ۳۲

★ یادِ رفتگاں ——— اسرار احمد

— مولانا داؤد غزنوی مرحوم کی یاد میں ——— ۴۸



خط کتابت اور ترسیل زر کا پتہ

دار الاشاعت الاسلامیہ امرت روڈ کرشن نگر، لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# تذکرہ و تبصرہ

پاکستان کا قیام ہرگز ایک معمولی واقعہ نہ تھا ـــــ دنیا کے نقشے پر اس طرح اچانک اور بالکل غیر متوقع طور پر وقت کی عظیم ترین مسلمان مملکت کا رونما ہو جانا یقیناً مشیتِ ایزدی اور حکمتِ خداوندی میں کسی بڑی تدبیر کے سلسلے کی کڑی تھا ـــــ اور اب ضرورت اس امر کی تھی کہ قوم کے تمام طبقات اسے ایک عطیۂ خداوندی اور نعمتِ خداداد سمجھتے اور ماضی کے تمام اختلافات کو بھلا کر کامل توافق و تعاون کے ساتھ اس کی تعمیر میں لگ جاتے، قیامِ پاکستان کے بعد اُس قومی قیادت پر جو اس کے وجود میں آنے کا ذریعہ بنی تھی ـــ اور جس کے ہاتھوں میں اس کی حکومت کے تمام اختیارات آئے تھے اچانک بہت سی عظیم اور کٹھن ذمہ داریاں عائد ہو گئی تھیں۔ اس کا فرض تھا کہ ایک طرف اس کے بقاء تحفظ اور دفاع و استحکام کا بندوبست کرتی اور اس کی انتظامی مشینری کو بدلے ہوئے حالات کے مطابق از سرِ نو استوار کر کے تعمیری و ترقیاتی منصوبوں پر عملدرآمد شروع کرتی ـــــ اور دوسری طرف قوم کی سیاسی تربیت کا ایسا بندوبست کرتی جس سے اس میں سیاسی شعور نشو و نما پاتا، خیالات میں یکرنگی اور مقاصد میں ہم آہنگی پیدا ہوتی۔ قومی و ملی احساسات اُجاگر ہوتے اور صحت مند سیاست کے خطوط متعین ہوتے چلے جاتے! ـــــ پاکستان کے بقا اور تحفظ و ترقی کے لئے فوری طور پر اگرچہ مقدم الذکر کام اہم تر تھا ـــ لیکن دیرپا استحکام اور ٹھوس تعمیر کے نقطۂ نظر سے موخر الذکر کام کہیں زیادہ ضروری تھا!

مذہبی و نیم مذہبی طبقات کو، عام اس سے کہ پہلے وہ پاکستان کے شدید مخالف تھے۔ یا، بزعمِ خویش، کسی عظیم تر منصوبے پر عمل پیرا رہے تھے۔ لازم تھا کہ وہ قیامِ پاکستان کو قدرت کا اشارہ سمجھ کر آئندہ کے لئے اپنے نقطۂ نظر کو بالکل تبدیل کر لیتے اور اسے اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا گہوارہ بنانے کے لئے مثبت تعمیری جدوجہد میں بدل و جان مصروف ہو جاتے۔ اس کے لئے ایک طرف یہ ضروری تھا کہ ہر گروہ اپنے مزاج کی مناسبت اور اپنی اپنی صلاحیتوں اور

توفیق کے تناسب سے اس عظیم جدّ و جہد کے کسی ایک شعبے کو سنبھال لیتا اور دوسری طرف یہ لازمی تھا کہ انتشار و افتراق کے تمام رخنوں کو قطعی طور پر بند کر دیا جاتا اور قومی قیادت کیساتھ حتے الامکان تعاون کی روش اختیار کی جاتی۔

وہ مذہبی حلقے جو جمعہ و جماعت اور درس و خطابت کے ذریعے عوام سے قریب ترین ربط و تعلق رکھتے تھے اور ان میں گہرے اثر و نفوذ کے مالک تھے۔ مذہبی، اخلاقی اور روحانی اقدار کے احیاء کے لئے انتہائی مؤثر کام کر سکتے تھے ——— اور جماعت اسلامی علمی و فکری سطح پر اسلامی انقلاب اور تہذیبی و ثقافتی میدان میں دینی اقدار کے احیاء کے لیے قیمتی خدمات سرانجام دے سکتی تھی۔

اس اعتبار سے جماعتِ اسلامی واقعتہً ایسی پوزیشن میں تھی کہ اپنے پیشِ نظر ہمہ گیر اور عالمگیر اسلامی انقلاب کے لئے قیام پاکستان کو ایک بہترین موقع کے طور پر استعمال کر سکتی تھی ———

مولانا مودودی نے چھ سات سال مسلمانانِ ہند کی قومی جدوجہد اور عام سیاسی سرگرمیوں سے علیحدہ رہ کر جو کام کیا تھا اس کے نتیجے میں انہوں نے ایک ایسی جمعیت فراہم کر لی تھی جو ایک اچھی بھلی تعداد میں ایسے مخلص اور سرگرم اور ساتھ ہی نظم اور باقاعدگی اور سلیقے اور قرینے کے ساتھ کام کرنے کی صلاحیت سے مسلح کارکنوں پر مشتمل تھی جن میں، کم از کم اسلام کو دنیا میں سربلند کرنے کی حد تک، اپنے مقصد اور نصب العین کا واضح شعور بھی موجود تھا اور اس کے لیے محنت و مشقت کے مادّے اور ایثار و قربانی کے جذبے کی بھی کمی نہ تھی ——— اور سب سے اہم یہ کہ اس جمعیت میں دین و دنیا اور قدیم و جدید کا وہ امتزاج بھی موجود تھا جو اس دور میں دین کی کسی بھی مؤثر خدمت کے لیے لازمی اور لابدی ہے۔ اس اعتبار سے یہ جمعیت مسلمانوں کے جدت پسند اور قدامت پرست طبقات کے مابین ایک "امتہ وسطیٰ" کا رول ادا کر سکتی تھی اور سراپا جامد مذہبیت اور از سرتاپیر متحرک متجددیت کے درمیان "سواء السبیل" کو واضح و روشن کر سکتی تھی۔

کاش کہ قوم کے ان تینوں اہم طبقات میں بدلے ہوئے حالات کے تقاضوں کا شعور بروقت پیدا ہو جاتا اور وہ کامل توافق و تعاون کی فضا میں اپنے اپنے حصے کے کاموں میں منہمک ہو کر اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی راہ ہموار کرنے میں لگ جاتے ——— لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوا ——— !!

---

جہاں تک قومی قیادت کا تعلق ہے۔ اگرچہ اس غریب پر قیام پاکستان کے فوراً بعد ہی مختلف خارجی و داخلی اسباب کی بنا پر نزع کا عالم طاری ہو گیا تھا۔ جس کی بنا پر پاکستان کے بقاء و استحکام اور تعمیر و ترقی کے

کام تو جیسے کچھ اور جتنے کچھ اس سے بن آئے اس نے کئے لیکن سیاسی میدان میں قوم کی تنظیم و تربیت اور قومی شعور اور ملی احساسات کو اجاگر کرنے کا کام وہ بالکل نہ کر پائی، تاہم جہاں تک تعاون و توافق کا تعلق ہے اس امر کا اعتراف کیا جانا چاہیئے کہ پاکستان کی پہلی قومی قیادت کی جانب سے اس سلسلے میں تنگ دلی اور بخل کا مظاہرہ قطعاً نہیں ہوا، ـــــ اور اس کے باوجود کہ بعض مذہبی حلقوں نے کھلم کھلا قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی ـــــ اور خود مولانا مودودی بھی نہ صرف یہ کہ اس سے بالکل علیحدہ رہے تھے بلکہ تحریک پاکستان کے آخری اور فیصلہ کن ایام میں اس پر شدید اور بعض اوقات دلآزار قسم کی تنقیدیں بھی کرتے رہے تھے ـــــ تاہم اپنا وقت آنے اور قوت و اقتدار پر بلا شرکت غیرے قابض ہونے کے بعد اس نے نہ صرف یہ کہ آزادی کی نعمتوں اور برکتوں سے متمتع اور مستفید ہونے کے معاملے میں مسلم لیگ کے حامیوں اور مخالفوں کے مابین فرق و امتیاز کا کوئی شائبہ بھی کبھی پیدا نہ ہونے دیا ـــــ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر تعاون کے دروازے پوری طرح کھول دیئے جس کی روشن ترین مثال یہ ہے کہ خود مولانا مودودی کو اپنے خیالات کے اظہار اور اپنے نظریات کی اشاعت کے بھرپور مواقع نہ صرف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بلکہ ریڈیو تک پر پوری وسعت قلب کے ساتھ مہیا کئے۔

اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ، اگرچہ ایک قومی جماعت ہونے کی بنا پر مسلم لیگ کی صفوں میں ہر نقطہ نظر اور مکتب فکر کے لوگ پائے جاتے تھے، حتیٰ کہ خالص ملحد اور دہریے بھی موجود تھے ـــــ لیکن پاکستان میں اس کی جو پہلی ٹیم برسر اقتدار آئی اس میں مخلص قوم پرست مسلمان، بلکہ خاصے مذہبی مزاج اور دینی مذاق کے لوگوں کو ایک فیصلہ کن پوزیشن حاصل تھی ـــــ!

اور اس ملک میں اسلام کے مستقبل کے اعتبار سے بہترین حکمت عملی یہ تھی کہ تمام دینی جماعتیں اور مذہبی حلقے پچھلے ذہنی تحفظات کو بالائے طاق رکھکر کھلے دل کے ساتھ قومی قیادت کے ساتھ تعاون کی روش اختیار کرتے اور ایک طرف اپنی تعلیمی و تبلیغی سرگرمیوں اور اخلاقی و عملی اصلاح کے کاموں میں مواقع اور وسائل کے اس اضافے سے فائدہ اٹھاتے جو مسلمانوں کی قومی ریاست میں حکومت کے ساتھ تعاون کی صورت میں متوقع تھا ـــــ اور دوسری طرف قومی قیادت کے مخلص اور مذہبی رجحان رکھنے والے لوگوں کے ہاتھوں کو مضبوط بناتے ـــــ لیکن افسوس کہ ایک مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور ان کے رفقائے کار کو چھوڑ کر اکثر مذہبی حلقوں نے یا تو لاتعلقی کی روش برقرار رکھی یا معاندانہ انداز اختیار کر لیا۔

فعال نیشنلسٹ علماء کی اکثریت اور ان کے اصل مراکز تو ہندوستان ہی میں رہ گئے تھے، پاکستان کے حصے میں صرف مجلس احرار آئی تھی۔ اس نے بظاہر بہت عقلمندی سے کام لیا اور سیاست کے میدان سے کامل کنارہ کشی

اختیار کر کے اپنی سرگرمیوں کو صرف دینی و مذہبی دائرے میں محدود کر لیا۔ لیکن ایک طویل عرصے تک کارزارِ سیاست میں گھمسان کی لڑائی لڑ چکنے والوں کے لئے سیاست سے کامل علیحدگی مشکل تھی۔ چنانچہ چند ہی سال بعد ان کی 'محبوس سیاسیت' ایک آتش فشاں کے مانند پھٹ کر رہی اور پاکستان کی سیاسیات کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اس حادثے نے پاکستان کی قومی و سیاسی زندگی کی گاڑی کو پٹڑی سے اتارنے میں اہم ترین حصہ ادا کیا ——!

علمائے دین کی ایک عظیم اکثریت نے قومی و سیاسی زندگی سے ایک گونہ لاتعلقی کی اُس روش کو برقرار رکھا۔ جس پر وہ تقریباً پون صدی سے عمل پیرا تھے اور پاکستان آکر بھی وہ حسبِ سابق کلیتہً تعلیمی و تدریسی مشاغل میں منہمک ہوگئے۔ چنانچہ یہ تو ضرور ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے کئی نئی اور عظیم دینی درسگاہیں پاکستان میں قائم ہوگئیں جن میں قال اللہ تعالیٰ اور قال الرسولؐ کی صدائیں زور شور سے بلند ہونے لگیں اور اس اعتبار سے یقیناً ایک قابلِ قدر اور بیش قیمت کام سرانجام پاگیا —— لیکن یہ بھی بجائے خود ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ ان کی ایک بڑی اکثریت کے قلب و دماغ نے قیامِ پاکستان کے بعد حالات میں جو تبدیلی آئی تھی اس سے کوئی اثر قبول نہ کیا —— اور نہ صرف یہ کہ اس امر کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ انہوں نے قیامِ پاکستان کو کوئی اہم واقعہ سمجھ کر اس کے زیر اثر اپنے نقشۂ کار حتیٰ کہ اپنے تعلیمی و تدریسی معمولات، یہاں تک کہ نصاب ہی میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس کی ہو۔ بلکہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ واقعہ کہ حکومت کی باگ ڈور غیر ملکی اور غیر مسلم حکمرانوں کے ہاتھوں سے نکل کر مسلمان قوم کے اپنے ہاتھ میں آگئی تھی، قطعاً کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا اور وہ اپنے ذہنوں میں نئے مسلمان حکمرانوں کو بالکل اسی مقام پر رکھ کر اپنے سابقہ طریق کار پر عمل پیرا رہے جس پر ان سے پہلے کے حکمران تھے —— بدقسمتی سے قومی قیادت کے بعض عناصر اور پاکستان کی مختلف سروسز کے اعلیٰ افسروں کی اکثریت نے مغربی طرزِ فکر اور یورپی طرزِ بود و باش کو جس حد تک اختیار کر لیا تھا، اس کے پیشِ نظر مذہبی طبقات کا یہ طرزِ عمل کسی حد تک فطری بھی تھا ——! بہرنوع ہوا یہ کہ قومی قیادت اور مذہبی حلقوں میں جو بُعد قیامِ پاکستان سے پہلے تھا وہ علیٰ حالہٖ قائم رہا —— اور اجنبیت اور غیریت کے پردے جوں کے توں حائل رہے، اور اگرچہ علماء کی ایک بڑی اکثریت نے اپنے آپ کو سیاسی سرگرمیوں سے دُور ہی رکھا لیکن اس مغائرت اور بُعد کی بنا پر یہ بہرحال ہوا کہ عدمِ اطمینان کی ایک کیفیت ان میں مستقل طور پر موجود رہی۔ جس سے مختلف سیاسی گروہ وقتاً فوقتاً فائدہ اٹھاتے رہے!

رہی جماعت اسلامی، جو اس دور میں احیائے اسلام کی سعی و جہد کے لئے سب سے زیادہ صلاحیت اور استعداد کی حامل تھی تو اس نے پاکستان میں جو طریق کار اختیار کیا وہ اس داستان کا المناک ترین باب ہے اور اس کی بدولت اس کی تمام قوتیں اور توانائیاں ایسے تخریبی راستوں پر پڑ گئیں جن سے نہ صرف یہ کہ ملک و ملت کو شدید نقصان پہنچا بلکہ خود اسلام کی راہ میں بے شمار رکاوٹیں کھڑی ہو گئیں!

---

۱۹۳۹-۴۰ء میں مولانا مودودی مسلمانانِ ہند کی قومی جدوجہد سے یہ کہہ کر علیحدہ ہوئے تھے کہ محض نام کے مسلمانوں کی تنظیم سے اسلامی حکومت کسی طرح قائم نہیں ہو سکتی، اس کے لئے لازم ہے کہ پہلے علمی و فکری اور ذہنی و نظری سطح پر اسلامی انقلاب برپا کیا جائے اور پھر معاشرے میں اخلاقی و عملی تبدیلی اس حد تک پیدا کر دی جائے کہ اس میں کسی جاہلی نظام کا چلنا دشوار ہو جائے، حکومت اور ریاست کی سطح پر کسی واقعی اور پائدار تبدیلی کی توقع اس کے بعد ہی کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا ہم مسلمانوں کی قومی جدوجہد کا ساتھ دینے میں اپنا وقت ضائع اور اپنی منزل کھوٹی کرنے کو تیار نہیں ہیں بلکہ اسی فطری طریق پر عمل پیرا ہو کر پہلے علمی و فکری ——— اور اخلاقی و عملی انقلاب برپا کرنے کی سعی کریں گے ——— چنانچہ قومی تحریک سے علیحدہ ہو کر مولانا نے علمی و فکری سطح پر اسلام کی دعوت دینے اور جو لوگ اسے قبول کر کے اسلام کے اوامر و نواہی کے عملاً پابند ہوتے چلے گئے انہیں ایک تنظیم میں منسلک کرنے کا کام شروع کر دیا ——— ——— قیامِ پاکستان کے بعد ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ مولانا اپنے اسی طریق پر عمل پیرا رہتے۔ اور جس قدر ممکن ہوتا اپنے اسی کام کی رفتار تیز تر کر دیتے اور اس کے ضمن میں مواقع و وسائل کے اس اضافے سے فائدہ اٹھاتے جو ایک مسلمان مملکت میں متوقع تھا ——— لیکن افسوس کہ اس موقع پر ان کی ذہانت نے ایک بالکل ہی نیا پینترا بدلا۔ چنانچہ اچانک ان کے دل میں اپنی اس "قوم" کا درد اٹھا جس کی قومی جدّ و جہد کے دوران وہ ایک خاموش تماشائی ہی نہیں رہے تھے بلکہ دور کھڑے ہو کر طنز و استہزا کے تیر برساتے رہے تھے، اور انہوں نے قوم کی حالت زار پر رحم کھاتے ہوئے اس کی "سرپرستی" قبول فرمائی۔ اور اس کی رہنمائی کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دیا مولانا کے اپنے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"..... اس لئے جس روز تقسیم ملک کا اعلان ہوا اسی وقت ہم نے سمجھ لیا کہ جیسی بری یا

بھلی تعبیر ہم آج تک کر سکے ہیں اب اسی پر اکتفا کرنی ہوگی اور اس قوم کو سنبھالنے کی فوراً کوشش کرنی پڑے گی جو کسی واضح نصب العین کے بغیر اور کسی اخلاقی و اجتماعی صلاح کے بغیر یک لخت یا اختیار ہو گئی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ساتھ ہی وہ اس 'مطالبے' کے ساتھ سیاست کی عین منجدھار میں کود پڑے کہ :
چونکہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا ۔ اور حصول پاکستان کی تحریک اسی مقصد کے تحت چلائی گئی تھی کہ یہاں اسلامی حکومت قائم کی جائے گی ـــــ اور چونکہ یہی اس ملک کے نوسو ننانوے فی ہزار باشندوں کی دلی خواہش ہے ـــــ لہذا لازم ہے کہ یہاں اسلامی دستور نافذ ہو اور شریعت اسلامی رائج کی جائے ـــــ اور چونکہ مسلمانوں کی قومی قیادت اب تک جن لوگوں کے ہاتھوں میں رہی ہے وہ ایک اسلامی حکومت کو چلانے کی صلاحیت سے عاری محض ہیں لہذا انہیں چاہیئے کہ وہ مسند قیادت و سیادت سے دستبردار ہو جائیں اور ایک دینی قیادت کے لیے جگہ خالی کر دیں ـــــ!

اس طرح گویا مولانا مودودی نے احساسِ فرض سے مجبور ہو کر بیک وقت اسلام اور پاکستانی قوم دونوں کی سرپرستی کا 'بوجھ' اپنے سر لے لیا !!

یہ وہ وقت تھا جب پاکستان کی قومی قیادت بہت سی داخلی و خارجی مشکلات میں مبتلا تھی ؛ ایک طرف ایک بالکل نئی لیکن وسیع و عریض اور دو انتہائی دور دراز خطوں پر مشتمل سلطنت کے پیچیدہ مسائل و معاملات تھے جن کا حل اور وہ بھی انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں بجائے خود ایک کٹھن مرحلہ تھا ، پھر اس پر تبادلۂ آبادی اور مہاجرین کی آبادکاری کے مہیب مسائل مستزاد ہو گئے دوسری طرف بانئ پاکستان اور ان کے دستِ راست قیامِ پاکستان کے بعد جلد ہی دنیا سے رخصت ہو گئے ، تیسری طرف قومی تحریک میں مخلص ، بے نفس اور تربیت یافتہ کارکنوں کی کمی کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہوئے اور قومی کارکنوں کی ایک بڑی اکثریت الاٹ منٹوں کے چکر اور پرمٹوں اور لائسنسوں کے حصول یا قوت و اقتدار کی کشمکش میں الجھ کر رہ گئی ـــــ قومی قیادت کے مخلص عناصر ابھی اس صورتِ حال سے نپٹنے کی فکر کر ہی رہے تھے کہ مولانا ، مودودی اپنی مختصر لیکن منظم جمعیت کو لے کر میدان میں آگئے اور انہوں نے پروپیگنڈے کی ایک موثر تکنیک سے ملک بھر میں ایک ہلچل سی پیدا کر دی ۔ چنانچہ قومی قیادت ایک نئے اور پیچیدہ مسئلے سے دوچار ہو گئی !

قومی قیادت کے لیے اس مسئلے کی پیچیدگی کا اہم ترین پہلو یہ تھا کہ جس اسلام کے نام پر مولانا

بھلی تعمیر ہم آج تک کر سکے ہیں اب اسی پر اکتفا کرنی ہوگی اور اس قوم کو سنبھالنے کی فوراً کوشش کرنی پڑے گی جو کسی واضح نصب العین کے بغیر اور کسی اخلاقی و اجتماعی صلاح کے بغیر یک لخت با اختیار ہو گئی ہے ......'

ساتھ ہی وہ اس 'مطالبے' کے ساتھ سیاست کی عین منجدھار میں کود پڑے کہ :

چونکہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا - اور حصول پاکستان کی تحریک اسی مقصد کے تحت چلائی گئی تھی کہ یہاں اسلامی حکومت قائم کی جائے گی ــــ اور چونکہ یہی اس ملک کے نوسونناوے فی ہزار باشندوں کی دلی خواہش ہے ــــ لہٰذا لازم ہے کہ یہاں اسلامی دستور نافذ ہو اور شریعت اسلامی رائج کی جائے ـــــــ اور چونکہ مسلمانوں کی قومی قیادت اب تک جن لوگوں کے ہاتھوں میں رہی ہے وہ ایک اسلامی حکومت کو چلانے کی صلاحیت سے عاری محض ہیں لہٰذا انہیں چاہیئے کہ وہ مسند قیادت و سیادت سے دستبردار ہو جائیں اور ایک 'نئی قیادت' کے لیے جگہ خالی کر دیں ـــــ!

اس طرح گویا مولانا مودودی نے احساسِ فرض سے مجبور ہو کر بیک وقت اسلام اور پاکستانی قوم دونوں کی سرپرستی کا 'بوجھ' اپنے سر لے لیا !!

یہ وہ وقت تھا جب پاکستان کی قومی قیادت بہت سی داخلی و خارجی مشکلات میں مبتلا تھی ؛ ایک طرف ایک بالکل نئی لیکن وسیع و عریض اور دو انتہائی دور دراز خطوں پر مشتمل سلطنت کے پیچیدہ مسائل و معاملات تھے جن کا حل اور وہ بھی انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں بجائے خود ایک کٹھن مرحلہ تھا ، پھر اس پر تبادلۂ آبادی اور مہاجرین کی آبادکاری کے مہیب مسائل مستزاد ہو گئے دوسری طرف بانیٔ پاکستان اور ان کے دستِ راست قیامِ پاکستان کے بعد جلد ہی دنیا سے رخصت ہو گئے ، تیسری طرف قومی تحریک میں مخلص ، بے نفس اور تربیت یافتہ کارکنوں کی کمی کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہوئے اور قومی کارکنوں کی ایک بڑی اکثریت الاٹ منٹوں کے چکر اور پرمٹوں اور لائسنسوں کے حصول یا قوت و اقتدار کی کشمکش میں الجھ کر رہ گئی ــــ قومی قیادت کے مخلص عناصر ابھی اس صورتِ حال سے نپٹنے کی فکر کر ہی رہے تھے کہ مولانا مودودی اپنی مختصر لیکن منظم جمعیت کو لے کر میدان میں آگئے اور انہوں نے پروپیگنڈے کی ایک موثر تکنیک سے ملک بھر میں ایک ہلچل سی پیدا کر دی - چنانچہ قومی قیادت ایک نئے اور پیچیدہ مسئلے سے دوچار ہو گئی !

قومی قیادت کے لئے اس مسئلے کی پیچیدگی کا اہم ترین پہلو یہ تھا کہ جس اسلام کے نام پر مولانا

مودودی سیاست کے میدان میں اترے تھے۔ وہ نہ صرف یہ کہ خود اس کا اپنا دین تھا بلکہ قریبی زمانے میں خود اس نے اسی کے نام پر عوام کے جذبات کو اپیل کیا تھا ـــــ لہٰذا مولانا مودودی کے 'مطالبہ' کا کوئی براہِ راست جواب اس کے لئے ممکن نہ تھا ـــــ دوسری طرف اسے یہ بھی نظر آرہا تھا کہ صورتِ حال ایسی بنا دی گئی ہے کہ اسلام کی جانب کسی قدم کا اٹھانا مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی کی 'دینی قیادت' کے معاملے میں پسپائی کے مترادف ہوگا، اس کا ایک بیّن ثبوت اس وقت مل بھی گیا جب 'قرار دادِ مقاصد' کو جو اصلاً خود تحریکِ مسلم لیگ کے مخلص اور دیندار عناصر (خصوصاً مولانا شبیر احمد عثمانیؒ) کی کوششوں سے منظور ہوئی تھی، جماعتِ اسلامی نے اپنی 'فتحِ مبین' قرار دے لیا! ـــــ لہٰذا قومی قیادت نے کچھ لیت و لعل سے کام لینا شروع کیا، کچھ مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی پر ہیر پھیر کے راستوں سے حملے شروع کیے، اور کبھی کبھی اسلامی دستور و قانون کے نفاذ کے مطالبے کی براہِ راست مخالفت بھی کی ـــــ اس معاملے میں پاکستان کی سیاست میں جو عجیب الجھاؤ پیدا ہو گیا تھا اس کا کسی قدر اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ قومی قیادت کے جانب سے اول اول جو لوگ مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی کے خلاف دلائل و براہین کے ہتھیار لے کر میدان میں اترے وہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور ڈاکٹر محمود حسین صاحب جیسے پابندِ صوم و صلوٰۃ اور دینی درد اور مذہبی جذبہ رکھنے والے لوگ تھے ـــــ! گویا جن لوگوں کے ہاتھوں کو مضبوط کرنے میں ملک و ملت اور دین و مذہب دونوں کی بھلائی تھی غلط حکمتِ عملی کی بنا پر انہی کو دشمنوں کی صف میں لا کھڑا کیا گیا ـــــ!! اور اسلام کو سیاسی میدان کا ایک مسئلہ بنا کر اسے اپنے بہترین بہی خواہوں کی سرپرستی سے محروم کر دیا گیا ـــــ! کاش! کہ مولانا مودودی سمجھ سکتے کہ اس طریق کار کو اختیار کر کے انہوں نے اسلام کی راہ میں کیسے کانٹے بو دیئے تھے!

'مذہبی سیاست' کے اس میدان میں اوّلاً مولانا مودودی نے تنہا اپنے اور اپنی جمعیت کے زورِ بازو کے بل پر چلنے کی کوشش کی لیکن جلد ہی انہوں نے یہ محسوس کر لیا کہ دوسرے دینی حلقوں کی مدد اور تعاون کے بغیر کامیابی مشکل ہے۔ چنانچہ انہوں نے وقتاً فوقتاً علمائے دین کا اشتراک و تعاون حاصل کرنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ کبھی انہیں اپنے پیچھے لگا کر اور کبھی، حالات کا رخ دیکھتے ہوئے، ان کے پیچھے لگ کر (جیسا کہ اینٹی قادیانی تحریک کے زمانے میں ہوا) ایک 'دینی کیمپ' کا تصور پیدا کیا ـــــ اس کے دو انتہائی مضر نتائج برآمد ہوئے: ایک یہ کہ سیاست کے میدان میں جماعتِ اسلامی

(بقیہ صفحہ ۴۷ پر)

تدبر قرآن

امین احسن اصلاحی

# تفسیر سورۂ نساء

۲

## ۴۔ آگے کا مضمون (آیات ۱۱-۱۴)

آگے کا مضمون۔ وراثت کی شرعی تقسیم

آگے تقویٰ، عدل اور رحم کے انہی تقاضوں کے مطابق جن پر اسلامی معاشرے کی بنیاد قائم ہے اس شرعی تقسیم وراثت کی وضاحت فرمادی جس کی طرف ساتویں آیت میں اشارہ ہوا تھا تاکہ ظلم و حق تلفی اور نزاع و اختلاف کے ایک بہت بڑے سبب کا خاتمہ ہو جائے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ ۚ فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً
فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۖ وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۚ
وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِنْ كَانَ لَهُ وَلَدٌ ۚ
فَإِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ وَلَدٌ وَوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهُ
إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ ۚ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ آبَاؤُكُمْ
وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۚ فَرِيضَةً مِنَ اللَّهِ ۗ إِنَّ
اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ۞ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُنَّ وَلَدٌ ۚ
فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ ۚ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَا
أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ
لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ ۚ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ
دَيْنٍ ۗ وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ
مِنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَإِنْ كَانُوا أَكْثَرَ مِنْ ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ ۚ مِنْ بَعْدِ
وَصِيَّةٍ يُوصَىٰ بِهَا أَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَارٍّ ۚ وَصِيَّةً مِنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ ۞
تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ ۚ وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ

تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۱۳ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَ يَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۱۴

اللہ تمہاری اولاد کے باب میں تمہیں ہدایت دیتا ہے کہ لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔ اگر لڑکیاں دو سے زائد ہیں تو ان کے لیے ترکے کا دو تہائی ہے۔ اور اگر اکیلی ہے تو اس کے لیے آدھا ہے۔ اور میت کے ماں باپ کے لیے ان میں سے ہر ایک کے لیے اس کا چھٹا حصہ ہے جو ورث نے چھوڑا، اگر میت کے اولاد ہو۔ اور اگر اس کے اولاد نہ ہو اور اس کے وارث اس کے ماں باپ ہی ہوں تو اس کی ماں کا حصہ ایک تہائی اور اگر اس کے بھائی بہنیں ہوں تو اس کی ماں کے لیے چھٹا حصہ ہے۔ یہ حصے اس وصیت کی تعمیل یا ادائے قرض کے بعد ہیں جو وہ کر جاتا ہے۔ تم اپنے باپوں اور بیٹوں کے متعلق یہ نہیں جان سکتے کہ تمہارے لیے سب سے زیادہ نافع کون ہوگا۔ یہ اللہ کا ٹھہرایا ہوا فریضہ ہے۔ بے شک اللہ ہی علم و حکمت والا ہے۔ ۱۱

اور تمہارے لیے اس ترکے کا نصف ہے جو تمہاری بیویاں چھوڑیں، اگر ان کے اولاد نہیں ہے۔ اور اگر ان کے اولاد ہے تو ان کے ترکے میں سے تمہارے لیے چوتھائی ہے۔ بعد اس وصیت کی تعمیل اور ادائے قرض کے جو وہ کر جائیں۔ اور ان کے لیے چوتھائی ہے تمہارے ترکے کا اگر تمہارے اولاد نہیں ہے اور اگر تمہارے اولاد ہے تو ان کے لیے آٹھواں حصہ ہے تمہارے ترکے کا۔ اس وصیت کی تعمیل اور ادائے قرض کے بعد جو تم کر جاؤ۔

اور اگر کسی مرد یا عورت کی وراثت اس حال میں تقسیم ہو کہ نہ اس کے اصول میں کوئی ہو، نہ فروع میں، اور ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو ان میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ ہے اور اگر وہ اس سے زیادہ ہوں تو وہ ایک تہائی میں شریک ہوں گے۔ اس وصیت کی تعمیل کے بعد جو کی گئی یا ادائے قرض کے بعد، بغیر کسی کو ضرر پہنچائے۔ یہ اللہ کی طرف سے وصیت ہے اور اللہ علیم و حلیم ہے۔ ۱۲

یہ اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حدیں ہیں۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت

کرتے رہیں گے اللہ ان کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کریں گے اور اس کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز کریں گے، ان کو ایسی آگ میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ ۱۳-۱۴

## ۵۔ بعض اہم ٹکڑوں کی وضاحت

مذکورہ بالا مجموعۂ آیات میں وراثت کے جو احکام بیان ہوئے ہیں وہ خود بھی واضح ہیں اور ان کی تفصیل فرائض کی کتابوں میں بھی موجود ہے اس وجہ سے ہم صرف بعض اہم باتوں کی وضاحت پر کفایت کریں گے۔

پہلی قابل توجہ چیز یہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے تقسیم وراثت سے متعلق جو احکام دیئے ہیں ان کو اپنی وصیت سے تعبیر فرمایا ہے۔ وصیت کا صحیح مفہوم عربی زبان میں یہ ہے کہ کوئی شخص کسی پر یہ ذمہ داری ڈالے کہ جب فلاں صورت پیش آئے تو وہ فلاں طریقہ یا فلاں طرز عمل اختیار کرے۔ اس میں وصیت کرنے والے کی پیش بینی، خیر خواہی اور شفقت کا پہلو بھی مضمر ہوتا ہے اور اس کے اندر ایک عہد اور معاہدے کی ذمہ داری بھی پائی جاتی ہے۔ لفظ کے ان تمام مضمرات کو ادا کرنے کے لیے اردو میں کوئی لفظ مجھے نہیں ملا۔ میں نے جو لفظ اختیار کیا ہے وہ اس کے مفہوم پر پوری طرح حاوی نہیں ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ وراثت میں لڑکوں کا حصہ اللہ تعالیٰ نے لڑکیوں کے بالمقابل دُونا رکھا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے نظام معاشرت میں کفالتی ذمہ داریاں اللہ تعالیٰ نے تمام تر مرد ہی پر ڈالی ہیں۔ عورت پر کوئی ذمہ داری نہیں ڈالی ہے۔ مرد ہی بیوی کے نان نفقے کا بھی ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے اور وہی بچوں کا بھی کفیل بنایا گیا ہے۔ قرآن نے یہ بات بھی واضح طور پر بتا دی ہے کہ اپنی خلقی صفات کے اعتبار سے مرد ہی اس کا اہل ہے کہ وہ خاندان کا سربراہ اور قوّام بنایا جائے اور یہ قوّامیت خاندان کے نظم اور اس کے قیام و بقا کے لیے ناگزیر ہے۔ اگر خاندان کا کوئی قوّام نہ ہو تو یہ بات خاندان کی فطرت کے خلاف ہے اور اگر خاندان کی قوّام مرد کے بجائے عورت ہو تو یہ چیز انسانی فطرت کے خلاف ہے اور فطرت کی ہر مخالفت لازماً

فساد و اختلال کا سبب ہو گی جس سے سارا معاشرہ درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ یہ چیز متقاضی ہوئی کہ مرد کو اس کی ذمہ داریوں کے لحاظ سے بعض حقوق میں ترجیح ہو۔ جو لوگ ہر پہلو سے مرد و عورت کی کامل مساوات کے مدعی ہیں ان کا دعویٰ عقل و فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ اس موضوع پر آگے ہم اس سورہ میں بھی بحث کریں گے۔ اور ہم نے اس پر ایک مستقل کتاب بھی لکھی ہے جس میں اس مسئلے کے سارے پہلو زیر بحث آئے ہیں۔[1]

تیسری چیز یہ ہے کہ قرآن حکیم نے یہ تنبیہ فرمائی ہے کہ یہ تقسیم اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کی حکمت پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا علم پیش و عقب ہر چیز پر حاوی اور حاضر و غائب سب پر محیط ہے۔ کسی کا علم بھی اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اس کی ہر بات اور اس کے ہر کام میں نہایت گہری حکمت ہوتی ہے اور کسی کا بھی یہ مرتبہ نہیں ہے کہ اس کی حکمت کی تمام باریکیوں کو سمجھ سکے۔ اس وجہ سے خدا کی اس تقسیم پر نہ تو اپنے علم و فلسفے کے غرّے میں کسی کو معترض ہونا چاہیئے نہ جذباتی جنبہ داری کے جوش میں کسی کو کوئی قدم اس کے خلاف اٹھانا چاہیئے۔ بسا اوقات آدمی اپنے ذاتی میلان کی بنا پر ایک کو دوسرے پر ترجیح دیتا ہے لیکن یہ ترجیح دنیا اور آخرت دونوں ہی اعتبارات سے غلط ہوتی ہے، اسی طرح کسی کو اپنے ذاتی میلان کی بنا پر نظر انداز کرتا ہے حالانکہ بعد کے حالات ثابت کرتے ہیں کہ دنیا اور عقبیٰ دونوں ہی اعتبار سے اس کا رویہ زیادہ صحیح رہا جس کو اس نے نظر انداز کیا۔ پس صحیح روش یہی ہے کہ آدمی جو قدم بھی اٹھائے اپنے ذاتی میلانات کے بجائے شریعت کی ہدایت کے مطابق اٹھائے، اسی میں خیر و برکت ہے۔ جو لوگ شریعت کے خلاف قدم اٹھاتے ہیں وہ خدا کے علم و حکمت کی تحقیر کرتے ہیں جس کی سزا بالعموم انہیں دنیا میں بھی ملتی ہے اور آخرت میں تو بہر حال ملنی ہی ہے۔ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا الآیۃ پیش اس روشنی میں غور فرمایئے۔

چوتھی چیز یہ ہے کہ خدا نے جب اس تقسیم کو اپنی وصیت سے تعبیر فرمایا ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ جن کو اس نے کسی مورث کا وارث قرار دیا ہے ان کے لیے اس نے انصاف اور حکمت پر مبنی وصیت خود فرما دی ہے۔ رب کریم و حکیم کی اس وصیت کے بعد اگر کوئی مورث کسی وارث کے لیے وصیت کرتا ہے تو درحقیقت یہ خدا کی وصیت کی اصلاح بلکہ صحیح تر الفاظ

---

[1] اس کے لیے ہماری کتاب "پاکستانی عورت" کی فصل "نظریہ مساوات مرد و زن" پڑھیئے۔

ہیں اس کی مخالفت ہوئی جو تقویٰ کے بالکل منافی ہے۔ اس سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ مورثوں کو وصیت کی جو اجازت دی گئی ہے اس کا تعلق ان وارثوں سے نہیں ہے جن کے باب میں خود خدا کی وصیت موجود ہے بلکہ یہ غیر وارثوں کے لیے خاص ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لا وصیۃ لوارث۔

پانچویں یہ کہ مورث کی وصیت کی تعمیل اور اس کے قرض کی ادائیگی کی تاکید جو بار بار آئی ہے اس کے ساتھ "غیر مضار" کی شرط بھی لگی ہوئی ہے۔ اگرچہ اس شرط کا ذکر صرف 'کلالہ' کے سلسلے میں ہوا ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ یہ ہر جگہ مقصود ہے۔ 'کلالہ' کے ساتھ اس کے ذکر کی وجہ صرف یہ ہے کہ جس مورث کے نہ اصول میں کوئی ہو نہ فروع میں اس کے اندر اس خواہش کے ابھرنے کا بڑا امکان ہوتا ہے کہ وہ اپنی جائیداد ان لوگوں کی طرف نہ منتقل ہونے دے جن کی طرف اس کا طبعی میلان نہیں ہے اگرچہ قانونی حق دار وہی ہیں۔ اس کے لیے وہ وصیت میں بھی تجاوز کر سکتا ہے اور غلط قسم کے نالشی قرض کا بھی مظاہرہ کر سکتا ہے۔ اس رجحان کو روکنے کے لیے قرآن نے وصیت اور قرض دونوں کے لیے یہ شرط لگادی کہ یہ "غیر مضار" ہو یعنی اس سے مقصود محض شرعی وارثوں کو نقصان پہنچانا نہ ہو۔ اسی بنیاد پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت کو ثلث مال تک محدود فرما دیا تاکہ اس سے اصلی وارثوں کی حق تلفی نہ ہو۔

## ۶۔ آگے کا مضمون، آیات (۱۵۔۱۸)

اوپر کی آیات میں ان مفاسد کے دروازے بند کیے تھے جو مال کی مفرط طمع سے پیدا ہوتے اور معاشرے میں فساد و اختلال اور قطع رحم کا سبب بنتے ہیں۔ اب آگے صنفی انتشار اور شہوانی بے قیدی پر پابندی عاید کی جا رہی ہے اس لیے کہ یہ بے قیدی بھی حرص مال ہی کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ معاشرے کو شیطان کی بازی گاہ بنا دینے والی ہے۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ احکام اس باب کے ابتدائی احکام ہیں جو اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جب کہ مدینہ میں اسلامی معاشرہ ابھی پوری طرح منظم و مستحکم نہیں ہوا تھا۔ مدینہ کے آس پاس غیر مسلم قبائل موجود تھے جو اس وقت تک اسلام کے زیر نگیں نہیں ہوئے تھے اور مسلمانوں نے ابھی وہ قوت حاصل نہیں کی تھی کہ اسلامی حدود و تعزیرات کو ان پر بھی نافذ کر سکیں۔ یہ صورت حال ایک پیچیدہ صورت حال تھی۔ نہ یہ بات قرین مصلحت تھی کہ معاشرے

کی تطہیر کے نقطۂ نظر سے جو حدود و تعزیرات ضروری ہیں وہ بے دریغ نافذ کر دی جائیں اس لیے کہ مخالفین اس سے غلط فائدے اٹھا سکتے تھے اور نہ یہ بات ممکن تھی کہ فحشا اور منکر کے دروازے کھلے چھوڑ دیئے جائیں اس لیے کہ اس سے بدکاری و بے حیائی کے اس رجحان کو شہ ملتی جس کا اس وقت عرب کی سوسائٹی میں زور تھا اور اسلام جس کو مٹانے کے لیے آیا تھا۔ ان دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے اسلام نے یہ حکیمانہ طریقہ اختیار کیا کہ جہاں تک مسلمانوں کی سوسائٹی کا تعلق تھا اس کو بدکاری و بے حیائی سے پاک رکھنے کے لیے کچھ ایسے ابتدائی نوعیت کے عارضی احکام دے دیے جو فی الجملہ مفاسد کے سدِّ باب کے لیے بھی مفید تھے اور جو مسلمانوں کے ذہن کو ان احکام کے قبول کرنے کے لیے تیار کرنے والے بھی تھے جو بعد میں اس سلسلے میں نازل ہوئے اور ساتھ ہی ان کے اندر یہ پہلو بھی ملحوظ تھا کہ مخالفین ان کو اسلام کے خلاف وسوسہ اندازیوں اور ریشہ دوانیوں کا ذریعہ نہیں بنا سکتے تھے ـــــ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۵-۱۸

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ۝ وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ۝ اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَی اللّٰهِ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ یَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِیْبٍ فَاُولٰٓئِكَ یَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ۝ وَلَیْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ ۚ حَتّٰۤی اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِیْنَ یَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۗ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ۝

ترجمہ

اور تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہوں تو ان پر اپنے اندر سے چار گواہ طلب کرو۔ پس اگر وہ گواہی دے دیں تو ان کو گھروں کے اندر محبوس کر دو، یہاں تک کہ موت ان کا خاتمہ کرے یا اللہ ان کے لیے کوئی راہ نکالے۔ ۱۵

اور جو دونوں تم میں سے اس بدکاری کا ارتکاب کریں تو ان کو ایذا پہنچاؤ۔ پس اگر وہ توبہ کر لیں اور اصلاح کر لیں تو ان سے درگزر کرو۔ بے شک اللہ

توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ ۱۶

اللہ پر توبہ قبول کرنے کی ذمہ داری تو انہی کے لیے ہے جو جہالت سے مغلوب ہو کر برائی کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں، پھر جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں، وہی ہیں جن کی توبہ اللہ قبول فرماتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ اور ان لوگوں کی توبہ نہیں ہے جو برابر برائی کرتے رہے، یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت سر پر آن کھڑی ہوئی تو بولا کہ اب میں نے توبہ کر لی ) اور نہ ان لوگوں کی توبہ ہے جو کفر ہی پر مرجاتے ہیں۔ ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۱۷-۱۸

## ۷۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ۝ وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ج فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ط اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝ (۱۵-۱۶)

'فاحشۃ' کھلی ہوئی بے حیائی اور بدکاری کو کہتے ہیں اور زنا کی تعبیر کے لیے یہ لفظ معروف ہے۔

'من نسائکم' (تمہاری عورتوں میں سے) یعنی بدکاری کا ارتکاب کرنے والی عورت مسلمانوں کے معاشرے سے تعلق رکھنے والی ہو۔

'او یجعل اللہ لھن سبیلا' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ حکم عارضی ہے۔ اس باب میں آخری حکم بعد میں نازل ہونے والا ہے۔ چنانچہ سورۂ نور میں زنا کی جو سزا بیان ہوئی ہے اس سے یہ وعدہ پورا ہوا۔

'والذٰن یاتینھا منکم' یعنی بدکاری کا ارتکاب کرنے والے دونوں فریق، مرد اور عورت، مسلمانوں ہی کے اندر کے ہوں۔ اس میں مذکر کا صیغہ عربی زبان کے معروف قاعدے کے مطابق شریک غالب کے لحاظ سے استعمال ہوا ہے جیسے کہ 'والدین' کا لفظ ہے جو ہے تو مذکر لیکن ماں باپ دونوں ہی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

ایذاء کا مفہوم

'فَاٰذُوْھُمَا' میں توہین و تذلیل، زجر و توبیخ، اور نفرت و ملامت سے لے کر اصلاح کے حد تک مار پیٹ ہر چیز داخل ہے۔

ان آیات میں خطاب ظاہر ہے کہ معاشرہ کے ارباب حل و عقد اور ذمہ داروں سے ہے ان کو خطاب کر کے بدکاری پر تعزیر کے لیے دو مختلف صورتوں میں دو الگ الگ ہدایات دی گئی ہیں۔

دو صورتوں کے لیے دو الگ الگ ہدایات

ایک صورت یہ ہے کہ بدکاری کا ارتکاب کرنے والی عورت تو مسلمانوں کے معاشرے سے تعلق رکھتی ہے لیکن اس کا شریک مرد، اسلامی معاشرے کے دباؤ میں نہیں ہے۔ ایسی صورت میں یہ ہدایت فرمائی کہ عورت کو گھر کے اندر محبوس کر دیا جائے، اس کی باہر کی آمد و شد پر پوری پابندی عاید کر دی جائے تا آنکہ موت اس کا خاتمہ کرے، یا اس باب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نیا حکم نازل ہو۔

دوسری صورت یہ ہے کہ بدکاری کے دونوں فریق مسلمانوں ہی سے تعلق رکھتے ہوں ایسی صورت میں ان کو زجر و توبیخ، تحقیر و تذلیل، ڈانٹ ڈپٹ اور اصلاح کے حد تک مار پیٹ سے درست کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگر وہ اس کے اثر سے توبہ کر کے اپنے چال چلن کو درست کر لیں تو پھر ان سے درگزر کیا جائے۔ اللہ توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

عورت کے معاملے میں شدتِ احتیاط کی حکمت

ان دونوں صورتوں پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ پہلی صورت میں احتیاط کا پہلو زیادہ شدت کے ساتھ ملحوظ ہے۔ دوسری صورت میں تو عورت اور مرد دونوں کو یہ موقع دیا گیا ہے کہ اگر وہ توبہ کر کے اپنے چال چلن درست کر لیں تو ان سے درگزر کر لیا جائے لیکن پہلی صورت میں عورت کے بارے میں یہ نہیں فرمایا کہ اگر وہ توبہ و اصلاح کر لے تو اس پر عائد کردہ قدغن اٹھا لی جائے۔ اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ دوسری صورت میں تو دونوں فریق اسلامی معاشرہ کے دباؤ میں ہیں، ان کے رویے میں جو تبدیلی ہوگی وہ سب کے سامنے ہوگی، نیز ان کے اثرات اور وسائل معلوم و معیّن ہیں، ان کے لیے بہر حال اپنے خاندان اور قبیلے سے بے نیاز ہو کر کوئی اقدام ناممکن نہیں تو نہایت دشوار ہوگا۔ لیکن پہلی صورت میں مرد، جو اصل جرم میں شریک غالب کی حیثیت رکھتا ہے، مسلمانوں کے معاشرہ کے دباؤ سے بالکل آزاد ہے نہ اس کے رویے کا کچھ پتہ نہ اس کے عزائم کا کچھ اندازہ، نہ اس کے اثرات و وسائل کے حدود معلوم و معیّن، ایسی حالت میں اگر عورت کو یہ موقع دے دیا جاتا کہ توبہ کے بعد اس سے درگزر

کیا جائے تو یہ بات نہایت خطرناک نتائج پر منتج ہوسکتی تھی۔ اوّل تو مرد کے رویّہ کو نظر انداز کر کے عورت کی توبہ و اصلاح کا کوئی صحیح اندازہ ہی ممکن نہیں ہے اور ہو بھی تو جب مرد بالکل قابو سے باہر اور مطلق العنان ہے تو اغوا، فرار اور قتل و خون کے امکانات کو کسی حال میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس پہلو سے اس میں احتیاط کی شدت ملحوظ ہے۔

اگرچہ یہ تعزیرات سورۂ نور میں نازل شدہ حدود کے بعد منسوخ ہوگئیں لیکن بدکاری کے معاملے میں شہادت کا یہی ضابطہ بعد میں بھی باقی رہا۔ علاوہ ازیں فامسکوھن فی البیوت کے الفاظ سے تعزیری مقاصد کے لیے جیل کے سسٹم کا جواز بھی نکلتا ہے۔

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓي اِذَا حَضَرَ اَحَدَھُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَھُمْ كُفَّارٌ ۭ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَھُمْ عَذَابًا اَلِـيْمًا (۱۷ - ۱۸)

'جہالت' کے معنی عربی میں صرف نہ جاننے کے نہیں آتے بلکہ اس کا غالب استعمال جذبات سے مغلوب ہوکر کوئی شرارت یا ظلم یا گناہ کا کام کر گزرنے کے معنی میں ہے یہ لفظ عام طور پر علم کے بجائے حلم کے ضد کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ ایک حماسی کا شعر ہے۔

وللحلم خیر فاعلمن مغبۃ　　　من الجھل الا ان تشمس من ظلم

اور یاد رکھو کہ جہالت کے مقابل میں تحمل و بردباری انجام کار کے اعتبار سے بہتر ہے مگر یہ کہ تمہیں ظلم کی وجہ سے ذلیل کرنے کی کوشش کی جائے۔

معلقات کا مشہور شعر ہے۔

الا لا یجھلن احد علینا　　　فنجھل فوق جھل الجاھلینا

آگاہ، کہ کوئی ہمارے خلاف جہالت کا اظہار نہ کرے کہ ہم بھی تمام جاہلوں سے بڑھ کر جہالت کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

اوپر والی آیت میں یہ جو فرمایا تھا کہ اگر وہ توبہ کرلیں اور اصلاح کرلیں تو ان سے درگزر کرو، اس سے اتنی بات تو بالکل واضح ہوگئی تھی کہ رویے کی اصلاح توبہ کے لازمی شرائط میں سے ہے، اگر کوئی شخص اس برائی سے باز نہ آئے جس کا وہ مرتکب ہوا ہے تو زبان سے

لاکھ توبہ توبہ کا وِرد کرے، اس کی توبہ بالکل غیر معتبر ہے۔ اسی تعلق سے توبہ کے آداب و خصوصیات کی مزید وضاحت فرما دی۔

فرمایا کہ اللہ کے اوپر صرف ان کی توبہ کا حق قائم ہوتا ہے جو جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی برائی کر گزرتے ہیں پھر فوراً توبہ کر لیتے ہیں۔ انہی لوگوں کی توبہ اللہ قبول فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ علیم اور حکیم ہے۔ نہ وہ کسی بات سے بے خبر نہ اس کا کوئی کام حکمت سے خالی۔ پھر وہ ان لوگوں کی توبہ کی کوئی ذمہ داری اپنے اوپر کیوں لے گا جو جانتے بوجھتے ٹھنڈے دل سے گناہ بھی کیے جا رہے ہیں اور توبہ کا وظیفہ بھی پڑھتے جا رہے ہیں۔

اسی طرح ان لوگوں کی توبہ بھی توبہ نہیں ہے جو زندگی بھر تو گناہوں میں ڈوبے رہے جب دیکھا کہ موت سر پر آن کھڑی ہوئی تو بولے کہ اب میں نے توبہ کی۔ علیٰ ہذا القیاس کفر کی حالت میں مرنے والوں کی بھی توبہ نہیں ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

ان دونوں آیتوں پر غور کرنے سے توبہ کی قبولیت اور عدم قبولیت کی دو صورتیں معیّن ہو جاتی ہیں۔ جو لوگ جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی برائی کر بیٹھتے ہیں پھر فوراً توبہ اور اصلاح کر لیتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر ان کی توبہ قبول کرنے کی ذمہ داری لی ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ برابر گناہ کیے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ جب ملک الموت ان کے سر پر آ دھمکتا ہے اس وقت وہ توبہ کرتے ہیں یا وہ لوگ جو کفر کی حالت ہی میں مرتے ہیں ان کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔

ان دونوں حدوں کے معیّن ہو جانے کے بعد اب ایک سوال رہ جاتا ہے کہ ان لوگوں کی توبہ کا کیا حکم ہے جن کو گناہ کے بعد جلدی توبہ کرنے کی سعادت تو حاصل نہیں ہوئی لیکن اتنی دیر بھی انہوں نے نہیں لگائی کہ موت کا وقت آن پہنچا ہو۔ اس سوال کے جواب میں یہ آیت خاموش ہے اور یہ خاموشی جس طرح امید پیدا کرتی ہے اسی طرح خوف بھی پیدا کرتی ہے اور قرآن حکیم کا منشا یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ بین الرجاء والخوف ہی رہے لیکن کبھی کبھی ذہن اس طرف جاتا ہے کہ اس امت کے اس طرح کے لوگ امید ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے نجات پا جائیں گے۔ اس لیے کہ ان کے باب میں شفاعت کے ممنوع ہونے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔

## ۸۔ آگے کا مضمون۔ آیات (۱۹-۲۲)

عورتوں کے حقوق معاشرے کے اندر محفوظ کرنے اور ان کو ظلم و تعدی سے بچانے کے لیے جو ہدایات اوپر دی گئی ہیں اسی سلسلے میں مزید ارشاد ہوا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا ۖ وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْتُمُوهُنَّ إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ﴿١٩﴾ وَإِنْ أَرَدْتُمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَكَانَ زَوْجٍ وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا ۚ أَتَأْخُذُونَهُ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُبِينًا ﴿٢٠﴾ وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهُ وَقَدْ أَفْضَىٰ بَعْضُكُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ وَأَخَذْنَ مِنكُم مِّيثَاقًا غَلِيظًا ﴿٢١﴾ وَلَا تَنكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُم مِّنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ۚ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَمَقْتًا ۖ وَسَاءَ سَبِيلًا ﴿٢٢﴾

ترجمہ

اے ایمان والو، تمہارے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ تم عورتوں کے زبردستی وارث بن جاؤ اور نہ یہ بات جائز ہے کہ جو کچھ تم نے ان کو دیا ہے اس کا کچھ حصہ واپس لینے کے لیے ان کو تنگ کرو مگر اس صورت میں کہ وہ کسی کھلی ہوئی بدکاری کی مرتکب ہوئی ہوں۔ اور ان کے ساتھ معقول طریقے کا برتاؤ کرو۔ اگر تم ان کو ناپسند کرتے ہو تو بعید نہیں کہ ایک چیز کو تم ناپسند کرو اور اللہ تمہارے لیے اس میں بہت بڑی بہتری پیدا کر دے۔ ۱۹

اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی بدلنا چاہو اور تم نے ایک کو ڈھیروں مال دے رکھا ہو تو بھی اس میں سے کچھ نہ لو، کیا تم بہتان لگا کر اور کھلی ہوئی حق تلفی کر کے اس کو لو گے؟ اور کس طرح اس کو لو گے جب کہ تم ایک دوسرے کے آگے بے حجاب ہو چکے ہو اور انہوں نے تم سے مضبوط عہد لے رکھا ہے۔ ۲۰-۲۱

اور جن عورتوں سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہوں ان سے نکاح نہ کرو۔

مگر جو کچھ ہو چکا۔ بے شک یہ کھلی بے حیائی اور نفرت کی بات ہے اور نہایت بُرا طریقہ ہے۔ ۲۲

## ۹۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا ۖ وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْتُمُوهُنَّ إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا (۱۹)

عضل کے معنی

'عضل یعضل' کے معنی تنگ کرنے، زچ کرنے اور روکنے کے ہیں۔

معاشرت بالمعروف

'عاشروھن بالمعروف' یعنی ان کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ کرو جو شریفوں کے شایانِ شان، عقل و فطرت کے مطابق، رحم و مروت اور عدل و انصاف پر مبنی ہو۔ یہاں لفظ معروف کے استعمال سے یہ بات نکلتی ہے کہ اگرچہ عرب جاہلیت کے بعض طبقات میں عورتوں کے ساتھ سلوک کے معاملہ میں بعض نہایت ناروا قسم کی زیادتیاں رواج پا گئی تھیں تاہم وہ اس بات سے ناآشنا نہیں تھے کہ عورت کے ساتھ معقولیت کا برتاؤ کیا ہے۔

عرب جاہلیت کے ایک مکروہ رواج کی اصلاح

اس آیت میں پہلے عرب جاہلیت کی ایک نہایت مکروہ رسم کی اصلاح کی ہے وہ یہ کہ ان کے بعض طبقات میں یہ رواج تھا کہ مورث کی جائداد اور اس کے مال مویشی کی طرح اس کی بیویاں بھی وارث کی طرف منتقل ہو جاتی تھیں۔ حد یہ ہے کہ باپ کی منکوحہ عورتوں پر بھی بیٹے قبضہ کر لیتے تھے۔ باپ کے مرنے پر خلف اکبر اس کی منکوحات میں سے جن پر اپنی چادر ڈال دیتا وہ سب اس کے تصرف میں آ جاتیں اور آگے آیت ۲۲ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ان سے زن و شو کے تعلقات قائم کرنے میں بھی قباحت محسوس نہیں کرتے تھے۔ قرآن نے یہاں واضح فرمایا کہ عورت مترو کہ جائداد نہیں بلکہ آزاد ہستی ہے۔ اس کے ساتھ مورث کی بھیڑ بکریوں کی طرح کا معاملہ جائز نہیں ہے بلکہ وہ اپنی مرضی کی مالک اور شریعت کے حدود کے اندر آزاد ہے۔

ناپسندیدگی سے متعلق ہدایت

دوسری بات یہ فرمائی کہ اگر کسی کو اس کی بیوی ناپسند ہو تو اس سے اپنا دیا دلایا اور کھلایا پہنایا اگلوانے کے لیے اس کو ضیق میں ڈالنے اور تنگ کرنے کی کوشش نہ کرے۔ اس

قسم کا رد یہ صرف اس شکل میں جائز ہے جب اس کی طرف سے کھلی ہوئی بدکاری کا صدور ہو۔ اگر اس قسم کی کوئی بات اس سے صادر نہیں ہوئی ہے، وہ بدستور اپنی وفاداری اور پاک دامنی پر قائم ہے تو مجرد اس بنیاد پر کہ بیوی پسند نہیں ہے اس سے کچھ اینٹھنے کے لیے اس کو تنگ کرنا عقل، انصاف، شرافت اور فتوت کے بالکل منافی ہے۔ قابلِ نفرت چیز صرف اخلاقی فساد ہے۔ محض شکل و صورت اور رنگ و روغن کے ناپسند ہونے کی بنا پر یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ شریفانہ معاشرت کے حقوق سے محروم کر دی جائے۔ ہو سکتا ہے کہ مجرد شکل و صورت کی بنا پر کوئی شخص اپنی بیوی کو ناپسند کرتا ہو لیکن اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے اس کے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں برکتوں کے بہت سے دروازے کھول دے۔ پس صحیح مومنانہ رویہ یہی ہے کہ اگر کسی کو اس طرح کی آزمائش پیش آجائے تو ذوقی عدم مناسبت کے باوجود خدا کے خوف اور اپنی فتوت و شرافت کے پیشِ نظر ایسی بیوی سے نہایت اچھا برتاؤ کرے اور خدا سے خیر و برکت کی امید رکھے۔

یہاں لفظ اگرچہ عسیٰ استعمال ہوا ہے جو عربی میں صرف اظہارِ امید اور اظہارِ توقع کے لیے آتا ہے لیکن عربیت کے اداشناس جانتے ہیں کہ اس طرح کے مواقع میں، جیسا کہ یہاں ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک قسم کا وعدہ مضمر ہوتا ہے۔ اس اشارے کے پیچھے جو حقیقت جھلک رہی ہے وہ یہی ہے کہ جو لوگ ظاہری شکل و صورت کے مقابل میں اعلیٰ اخلاقی و انسانی اقدار کو اہمیت اور ان کی خاطر اپنے جذبات کی قربانی دیں گے ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیرِ کثیر کا وعدہ ہے۔ جن لوگوں نے اس وعدے کے لیے بازیاں کھیلی ہیں وہ گواہی دیتے ہیں کہ یہ بات سو فی صدی حق ہے اور خدا کی بات سے زیادہ سچی بات کس کی ہو سکتی ہے۔

وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ۭ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝ وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝ (۲۰-۲۱)

قنطار

'قنطار' اصل میں تو ایک وزن ہے جس کی مقدار زمانے کے ساتھ گھٹتی بڑھتی رہی ہے لیکن عام استعمال میں اس سے مراد مالِ کثیر ہوتا ہے۔ جیسے ہم منوں مال، ڈھیروں مال، بولتے

ہیں عربی میں اسی مفہوم کی تعبیر کے لیے یہ لفظ ہے۔ اسی سے "قناطیر مقنطرۃ" کی ترکیب بھی قرآن میں استعمال ہوئی ہے۔

'افضٰی بعضکم الی بعض' افضٰی فلان الی فلان کے معنی ہیں وصل الیہ و دخل فی حیزہ اسی طرح افضٰی الی فلان بسرّہ، کے معنی ہیں اس نے فلاں کے آگے اپنے سارے بھید بے نقاب کر دیئے۔ یہ میاں بیوی کے ازدواجی تعلقات کی نہایت جامع اور نہایت شائستہ تعبیر ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے اس طرح بے نقاب ہو جاتے ہیں کہ ان کے ظاہر و باطن اور احساسات و جذبات کا کوئی گوشہ اور کوئی پہلو ایک دوسرے سے مخفی نہیں رہ جاتا۔

افضی بعضکم الی بعض

اوپر کی آیت میں بتایا تھا کہ ناپسندیدگی کے باوجود اعلیٰ طریقہ یہی ہے کہ آدمی بیوی کے ساتھ شائستہ طریقے پر نباہنے کی کوشش کرے اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ کوئی شخص اپنے حالات کے تقاضوں سے اگر اس فیصلہ پر پہنچ ہی گیا ہے کہ ایک بیوی کو چھوڑ کر کسی دوسری عورت سے شادی کرے تو یہ تو بہر حال وہ نہ کرے۔ کہ جو کچھ پہلی بیوی کو اس نے دیا ہے اس کو واپس لینے کی کوشش کرے۔ یہاں تک کہ اگر اس کو ڈھیروں مال بھی اس نے دیا ہے جب بھی اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ اس کے واپس لینے کے لیے ہتھکنڈے استعمال کرے۔ خاص کر اس خیال سے اس پر بہتان لگانا کہ اس سے دیا ہوا مال واپس لینے کے لیے جواز پیدا ہو سکے اور بھی بڑا گناہ اور ظلم ہے۔ پھر فرمایا کہ یہ مرد کی فتوت کے بالکل منافی ہے کہ جس عورت کے ساتھ اس نے زندگی بھر کا پیمان وفا باندھا، جو ایک نہایت مضبوط میثاق کے تحت اس کے حبالۂ عقد میں آئی جس نے اپنا سب ظاہر و باطن اس کے لیے بے نقاب کر دیا اور دونوں نے ایک مدت تک یک جان دو قالب ہو کر زندگی گزاری، اس سے جب جدائی کی نوبت آئے تو اپنا کھلایا پہنایا ہوا اس سے اگلوانے کی کوشش کی جائے یہاں تک کہ اس ذلیل غرض کے لیے اس کو بہتانوں اور تہمتوں کا بھی ہدف بنایا جائے۔

بیوی سے دیا ہوا مال واپس لینا فتوت کے منافی ہے

یہاں ایک اور چیز بھی قابل غور ہے۔ وہ یہ کہ فرمایا ہے واخذن منکم میثاقا غلیظا (اور ان عورتوں نے تم سے مضبوط میثاق لیا ہے) ظاہر ہے کہ "میثاق غلیظ" سے مراد یہاں عقد نکاح ہی ہے۔ اس کے سوا کسی اور میثاق کا نہ یہاں کوئی قرینہ ہے نہ اس کی کوئی تاریخی شہادت پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ عقد نکاح کی ذمہ داری کو یہاں "میثاق غلیظ" سے کیوں تعبیر فرمایا۔

عہد نکاح ایک محکم میثاق ہے

میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ عقدِ نکاح کی اصل عرفی اور شرعی حقیقت یہی ہے کہ وہ میاں اور بیوی کے درمیان حقوق اور ذمہ داریوں کا ایک مضبوط معاہدہ ہوتا ہے جس کے ذریعے سے دونوں زندگی بھر کے سنجوگ کے عزم کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ جڑتے ہیں اور دونوں یکساں طور پر حقوق بھی حاصل کرتے ہیں اور یکساں طور پر ایک دوسرے کے لیے ذمہ داریاں بھی اٹھاتے ہیں۔ بظاہر تو اس میثاق کے الفاظ نہایت سادہ اور مختصر ہوتے ہیں لیکن اس کے مضمرات و تضمنات بہت ہیں اور یہ مضمرات و تضمنات ہر مہذب سوسائٹی اور ہر شریعت میں معلوم و معروف ہیں۔ یہ امر بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ میثاق بندھتا تو ہے میاں اور بیوی کے درمیان لیکن اس میں گرہ خدا کے حکم سے لگتی ہے اور جس طرح خلق اس کی گواہ ہوتی ہے اسی طرح خالق بھی اس کا گواہ ہوتا ہے۔ پھر اس کے "میثاق غلیظ" ہونے میں کیا شبہ رہا؟ یہاں اس رشتے کو اس لفظ سے تعبیر فرما کر قرآن نے اس کی اصلی عظمت واضح فرمائی ہے کہ مرد کو کسی حال میں بھی یہ بھولنا نہیں چاہیئے کہ بیوی کے ساتھ اس کا تعلق کچے دھاگے سے نہیں بندھا ہوا ہے بلکہ یہ رشتہ نہایت محکم رشتہ ہے اور اس کے تحت جس طرح مرد کے حقوق ہیں اسی طرح بیوی کے بھی حقوق ہیں جن سے مرد کے لیے فرار کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر وہ ان سے بھاگنے کی کوشش کرے گا تو اپنی فتوت کو بھی رسوا کرے گا اور اپنے خدا کو بھی ناراض کرے گا۔

وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُمْ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ۚ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَمَقْتًا وَسَاءَ سَبِيلًا (۲۲)

مقت اور ممقوت، مبغوض اور نفرت انگیز شے یا فعل کو کہتے ہیں۔ باپ کی منکوحہ سے نکاح کے لیے "زواج المقت" کی تعبیر مشہور رہی ہے۔ اسی طرح اس شخص کو "مقتی" کہتے تھے جو اس فعل شنیع کا مرتکب ہوا ہو۔

'الا ما قد سلف' کا مطلب یہ ہے کہ یہ قانون ماضی پر لاگو نہیں ہوگا کہ اس کو بنیاد قرار دے کر تمام پچھلے رشتوں کی تحقیق ہو اور اس کی روشنی میں جائز و ناجائز کے احکام صادر ہوں۔ یہ چیز عملاً ناممکن ہے۔ قانون اپنی فطرت ہی سے ایک ایسی چیز ہے کہ اس کا نفاذ حاضر و مستقبل ہی پر ہو۔ چنانچہ ماضی سے درگزر کر کے ان برائیوں کی اصلاح کر دی گئی جو بالفعل موجود تھیں اور آئندہ کے لیے اس بے حیائی کا سدِّ باب کر دیا گیا۔

آیت ۱۹ کے تحت گزر چکا ہے کہ عرب جاہلیت کے بعض طبقات میں یہ رواج تھا کہ

باپ کی منکوحات بیٹے کو وراثت میں ملتی تھیں اور بیٹے ان سے زن وشو کے تعلقات قائم کرنے میں بھی کوئی قباحت نہیں محسوس کرتے تھے۔ اس آیت نے اس فعل شنیع کی حتمی ممانعت کر دی۔ فرمایا کہ یہ فعل کھلی ہوئی بے حیائی و بدکاری، نہایت مبغوض اور نہایت برا رواج ہے۔

یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ اس قسم کی برائیوں اور بے حیائیوں کا ذکر قرآن میں جو عام صیغے سے آتا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ اس میں لازماً پوری قوم مبتلا تھی۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ برائی کسی خاص طبقے کے اندر محدود ہوتی ہے لیکن اس سے متعلق قانون چونکہ سب پر حاوی ہوتا ہے اس وجہ سے خطاب عام ہوتا ہے۔ یہاں اس برائی کے لیے جو الفاظ استعمال فرمائے ہیں وہ خود شاہد ہیں کہ اس کا کھلی ہوئی بے حیائی اور مبغوض ہونا عرب کے شرفا کو بھی معلوم تھا۔

خصوصی طبقات کی برائیوں کا ذکر صیغہ عام سے

---

## بقیہ رویت ہلال کا مسئلہ

حال کو کیوں نہ برداشت کیا جائے۔ یہ واضح رہے کہ پاکستان کا رقبہ اتنا زیادہ ہے کہ ممالک عرب کی دو دو تین تین ریاستیں اس میں سما سکتی ہیں اور مشرقی و مغربی پاکستان کے درمیان کا فاصلہ اس پر مستزاد ہے۔

**چھٹی** یہ کہ کسی علاقے میں چاند نظر نہ آنے کے باوجود لوگوں کو عید منانے پر مجبور کر دیا جائے تو ذہنی اور نفسیاتی طور پر وہ جس کشمکش سے دوچار ہوتے ہیں اس کی مضرت دو عیدیں منانے کے انتشار کی نسبت کہیں زیادہ ہوتی ہے ایسی مجبوری کی عید پر ان کا ردعمل ہماری ملی زندگی کے لیے کسی طرح خوش آئند نہیں ہو سکتا۔ اس سے نہ صرف دلوں میں تکدر اور مایوسی پیدا ہوتی ہے بلکہ عید کی ساری خوشی چھن جاتی ہے۔

ان پہلوؤں کے پیش نظر اختلاف مطالع کو نظر انداز کر کے پورے ملک میں ایک ہی دن عید منانا کسی طرح مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ واضح رہے کہ اصل انتشار ایک علاقے میں ــــ اور خصوصاً ایک شہر میں دو عیدیں منانے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

اس صورت حال کو پیدا نہیں ہونے دینا چاہیے اور اس کو روکنے کے لیے اسی طرح کی تدابیر اختیار کی جائیں جو اوپر بیان کی گئی ہیں۔

افاداتِ فراہیؒ

خالد مسعود

# ملکوت اور سنۃ اللہ

ملکوت الٰہی کا یہ پہلو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے، ہمیشہ سے واضح ہے۔ قرآن کی تصریح کے مطابق امتوں کے ساتھ خدا کا جو معاملہ رہا ہے وہ ٹھیک اس کی اس سنت کے مطابق تھا۔ ایک جگہ فرمایا ہے۔

| | |
|---|---|
| قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى | کہہ دے، اے میری قوم تم اپنی جگہ عمل |
| مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ | کئے جاؤ، میں اپنی جگہ عمل کئے جاؤں گا۔ |
| فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ تَكُوْنُ | پھر عنقریب تم جان لوگے کہ انجام کار |
| لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ اِنَّهٗ | کس کے حق میں ہوتا ہے۔ البتہ یہ حقیقت |
| لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (انعام ۱۳۵) | ہے کہ ظالم کامیاب ہونے کے نہیں۔ |

اس کا مطلب یہ ہے کہ انجام کار زمین کی وراثت متقیوں کو حاصل ہوگی۔ رہے ظالم تو اللہ تعالیٰ ان کو ہلاک کر دے گا۔ یہی بیان زبور میں بھی ہے اور یہی خدا کے عدل، اس کی قدرت اور علم سے مطابقت بھی رکھتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو دوام حاصل ہے۔ اس لئے اس کی سنت کو بھی دوام ہے۔ اس میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ اسی لئے فرمایا۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا اور تو خدا کی سنت میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ پائے گا۔

البتہ اللہ تعالیٰ کا ہر معاملہ اس کی حکمت کے مطابق ہوتا ہے اور یہ بھی خدا ہی کی ایک سنت ہے۔

**سنت اللہ کو جاننے کے طریقے** سنت اللہ کو جاننے کے تین طریقے ہیں۔

(الف) یہ معلوم کرنا کہ خدا کی کامل صفات مثلاً حکمت، رحمت، عدل اور علم کا تقاضا کیا ہے۔

(ب) اس مشاہدہ کے ذریعے کہ گذشتہ قوموں کے ساتھ خدا نے کیا معاملہ کیا اور آج کل کی قوموں کے ساتھ کیسے معاملہ کر رہا ہے۔ گذشتہ قوموں کے بارے میں آسمانی کتابیں

صحیح معلومات فراہم کرتی ہیں۔

(ج) اس تحقیق کے ذریعے کہ خدا نے اپنی کتابوں میں کیا کیا وعدے فرمائے ہیں۔ مثلاً جیسے اہل کتاب کے تورات و انجیل کے ساتھ رویہ کے بارے میں فرمایا۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ (مائدہ ۶۶)

اگر وہ قائم کرتے تورات اور انجیل کو اور اس ہدایت کو جو ان پر ان کے رب کی طرف سے اتاری گئی، تو وہ اپنے اوپر سے اور اپنے پیروں کے نیچے سے رزق پاتے۔

ان تین ذرائع سے بہت سی باتیں متفقہ طور پر ثابت ہو جاتی ہیں جس سے ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ یہی فی الحقیقت سنۃ اللہ ہیں۔

## انسان سے متعلق ملکوت الٰہی

اب ہم اختصار کے ساتھ قرآن مجید سے وہ اصول جمع کرتے ہیں جن کے مطابق انسان کے معاملات میں خدا کا حکم جاری ہوتا ہے:۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل عطا کی ہے اور خیر و شر کا الہام اسے ودیعت فرمایا ہے

۲۔ اس نے اختیار کی آزادی دی اور خلافت عطا کی۔

۳۔ جس طرح وہ بارش برسا کر اپنی رحمت عام کرتا ہے۔ اسی طرح اس نے عقل کی تکمیل کے لیے وحی بھیجنے کا انتظام فرمایا۔

۴۔ اپنی طرف مائل کرنے کے لیے اس نے اچھے اور برے حالات میں انسان کو مبتلا کیا۔

۵۔ وہ حق کی نصرت فرماتا ہے اور باطل کو مٹاتا ہے۔

۶۔ وہ خیر اور شر کے نتائج امن و خوف اور نور و ظلمت کی شکل میں ظاہر کرتا ہے۔

۷۔ وہ نور و ظلمت کو اتنا نمایاں کرتا ہے کہ الگ الگ ہو جاتے ہیں۔

۸۔ ظلمت کے پھیلنے پر نافرمانوں کو مہلت دیتا ہے اور اس کے بعد انہیں ہلاک کر دیتا ہے۔

۹۔ انسان سے جیسا عمل ظاہر ہوتا ہے ویسا ہی اس کا نتیجہ مترتب فرماتا ہے۔ جیسے فرمایا۔

فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (صف ۵)

پھر جب وہ کج ہو گئے تو خدا نے ان کے دلوں کو کج کر دیا۔

دوسری جگہ فرمایا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْھِمْ ءَاَنْذَرْتَھُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَعَلٰی سَمْعِھِمْ وَعَلٰی اَبْصَارِھِمْ غِشَاوَۃٌ وَّلَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (بقرہ ۶،۷)

جن لوگوں نے کفر کیا، ان کے لیے یکساں ہے انہیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ، وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مُہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لئے عذاب عظیم ہے۔ (بقرہ، ۶-۷)

یہاں کفر کا جو نتیجہ بیان فرمایا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کفر خود ایک پردہ ہے چوں کہ اللہ تعالٰی کی تمام نعمتیں انسان کے حواس پر بالکل ظاہر ہیں اس لیے جو شخص کفر کرتا ہے وہ درحقیقت غفلت کرتا ہے اور جانتے بوجھتے اپنے آپ کو اندھا بہرا بنا لیتا ہے۔ یہ رویہ تو اس کا عقلی لحاظ سے ہوتا ہے، دوسرے پہلو سے دیکھا جائے تو وہ اس طرح اخلاق کی بنیاد ـــ شکر ـــ کو منہدم کر دیتا ہے۔ اسی لیے اس کو عذاب بھی دیا جائے گا۔ اس کے طرزِ عمل کی حقیقت گویا ایسی ہے جیسے خدا نے اسے نعمتوں سے نوازا مگر اس نے ان کی طرف سر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

ایک اور موقع پر یوں آیا ہے:-

فَبِمَا نَقْضِھِمْ مِّیْثَاقَھُمْ لَعَنّٰھُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَھُمْ قٰسِیَۃً یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِہٖ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُکِّرُوْا بِہٖ

پس ان کے میثاق توڑنے کے سبب سے ہم نے ان پر لعنت کر دی اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا کہ وہ کلمات کو ان کے مواقع سے پھیرتے ہیں، اور جو یاددہانی ان کو کرائی گئی تھی اس کے ایک حصہ کو انہوں نے بھلا دیا۔ (مائدہ-۱۳)

میثاق وعہد نامہ ایک ایسی چیز ہوتی ہے جس کی خلاف ورزی سے ہمیشہ ڈرا جاتا ہے، اس کے الفاظ کی حفاظت ہر چیز سے بڑھ کر ہوتی ہے اور اس کی یاد ہر وقت دل میں مستحضر رکھی جاتی ہے۔ یوں بھی میثاق بندے کے لیے سب سے اونچا درجہ ہے کیونکہ اس کی بدولت وہ اپنے رب کے ہاں اپنے کچھ حقوق رکھتا ہے یہ مرتبہ اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب اللہ تعالٰی نے

خاص نعمت کے لیے کسی کو چن لے اور اس کو تمام لوگوں پر فضیلت دے دے۔ اس کے بالمقابل لعنت کی حقیقت دھتکار دینا ہے۔ پس جب کسی نے میثاق کی خلاف ورزی کی تو وہ لعنت کا مستحق ہو گیا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ہر بُرے کام کے کچھ ایسے نتیجے اللہ تعالیٰ ظاہر فرماتا ہے جو اس کام سے حقیقی اور سچی مناسبت رکھتے ہیں۔

## ملکوت کا تصرف ظاہر سے باطن کی طرف

قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝ (انفال ۴۵، ۴۶)

اے ایمان والو، جب دشمن کی کسی ٹولی سے تمہاری مڈبھیڑ ہو جائے تو ثابت قدم رہا کرو اور اللہ کا خوب ذکر کیا کرو۔ تاکہ تم کامیاب رہو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اور اختلاف نہ کرو ورنہ کمزور ہو جاؤ گے، اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور ثابت قدمی دکھاؤ بلاشبہ اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہوتا ہے

یہاں فلاح و کامرانی کا انحصار دو چیزوں پر بتایا۔ ایک صبر اور دوسری خدا کا ذکر۔ اس حقیقت کی نظیر بھی موجود ہے۔ فرمایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ (بقرہ۔۱۵۳)

اے ایمان والو! ثابت قدمی اور نماز سے مدد چاہو بے شک اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہے۔

ایک اور موقع پر اپنی خصوصی امداد کو صبر اور تقوے کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ فرمایا

بَلَىٰ إِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا وَيَأْتُوكُم مِّن فَوْرِهِمْ هَٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُم بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ (آل عمران ۱۲۵)

ہاں اگر تم ثابت قدم رہو گے اور بچتے رہو گے اور وہ تمہارے اوپر ابھی آ دھمکیں تو تمہارا رب پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد فرمائے گا جو اپنے خاص نشان لگائے ہوئے ہوں گے۔

(آل عمران - ۲۵)

اسی سے ملتی جلتی ایک آیت ہے

| | |
|---|---|
| وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ (آل عمران - ۱۲۰) | اور اگر تم صبر کرو گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو ان کی چال تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گی وہ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ اس کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔ |

فلاح و کامیابی کا صبر و تقوے کے ساتھ یہ تعلق مبنی ہے بندے کے توکل اور پروردگار کی غیرت پر۔ بندہ جب پروردگار پر بھروسہ کرتا ہے اور اپنے گرد و پیش کی ہر چیز کا سہارا چھوڑ دیتا ہے تو خدا کی غیرت جوش میں آتی ہے وہ اس کی نصرت فرماتا ہے اور اپنی جانب کی روح سے اس کی تائید فرماتا ہے۔ یہ حقیقت ذیل کی آیات میں بھی بیان ہوئی ہے۔ فرمایا ہے۔

| | |
|---|---|
| اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (آل عمران ۱۷۳-۱۷۵) | وہ جن کو لوگوں نے سنایا کہ دشمن نے تمہارے لیے بڑی طاقت اکٹھی کی ہے تو اس سے ڈرو تو اس چیز نے ان کے ایمان میں اور اضافہ کر دیا اور وہ بولے کہ اللہ ہمارے لئے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ سو یہ لوگ اللہ کی نعمت اور اس کے فضل کے ساتھ واپس آئے۔ ان کو ذرا گزند نہ پہنچا اور یہ اللہ کی خوشنودی کے طالب ہوئے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ یہ شیطان ہے جو اپنے رفیقوں کو ڈراوے دے رہا ہے تو تم ان سے نہ ڈرو۔ مجھی سے ڈرو، اگر تم مومن ہو۔ |

یہاں سیاق و سباق شاہد ہے کہ 'ان کنتم مومنین' میں مومنین سے مراد متوکلین ہے

خالد مسعود

# رویت ہلال کا مسئلہ

اسلام میں مہینوں کا تعین قمری تقویم کے مطابق کیا گیا ہے اور عبادات ہوں یا معاملات ان میں مدت کے شمار کے لیے اسی تقویم کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ عبادات میں روزہ، اعتکاف زکوٰۃ اور حج کے معاملے میں اور معاشرتی امور میں رضاعت، طلاق اور عدت وغیرہ کے ضمن میں قمری مہینوں کے تعین کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسلام جیسے آفاقی مذہب کے لیے شمسی تقویم کسی طرح مناسب نہ تھی کیونکہ اس شکل میں مختلف علاقوں میں بسنے والے لوگ مذکورہ عبادات کے دائرے میں ہمیشہ کے لئے مخصوص موسموں کے ساتھ جکڑ دیئے جاتے ہیں اور یہ چیز ایک طرح کی بے انصافی کا باعث بنتی۔ قمری حساب سے عبادات ہر سال موسم بدل کر آتی ہیں اور ہر جگہ کے مسلمانوں کو یکساں نرمی گرمی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ مزید برآں شہروں کے علم و ہنر اور انتظام و انصرام سے دور رہنے والی ہر ملک کی ناخواندہ آبادی کے لیے جو دور دراز علاقوں، صحراؤں اور پہاڑوں میں بستی ہے۔ مہینوں کا تعین شمسی تقویم کے مطابق کرنا ایک از حد مشکل کام ہے جبکہ چاند کو دیکھنے کے لیے کسی بڑی عقل یا مہارت کی ضرورت نہیں۔

قمری تقویم کی یہ حکمتیں بالکل واضح ہیں مگر یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ اس میں مشکلات بھی ہیں۔ مثلاً آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہوں تو یہ طے کرنا کہ چاند ہوا یا نہیں، ایک انتہائی مشکل کام ہے۔ اسی طرح چاند ہو جانے کے باوجود اگر افق کے اوپر اس کا ظہور قلیل وقت کے لئے ہو، تو چاند کو دیکھ سکنے کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں۔ تاہم ان مشکلات کے باوصف شریعت نے قمری تقویم ہی کو اس کی موزونیت کے باعث اختیار کیا ہے۔

اگر دیکھا جائے تو قمری مہینے کے تعین کی یہ مشکلات عملاً کچھ زیادہ اثر انداز نہیں ہوتیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اول تو بادل کے سبب سے چاند نظر نہ آسکنے کا حادثہ ہر مہینے پیش نہیں آتا — دوسرے اگر پہلی شب کو چاند ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ ہو سکے تو دوسرے یا تیسرے دن اس کا تعین بآسانی ہو سکتا ہے اور اتنی سی تاخیر سے معاملات میں کوئی بڑا نقصان واقع

نہیں ہوتا، البتہ رمضان کے آغاز اور اختتام کے موقع پر اگر یہ مشکل پیش آجائے تو قومی زندگی میں سخت افتراق و انتشار کی نوبت آجاتی ہے۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ شریعت کے اصول کی روشنی میں رویت ہلال کا ایسا طریق کار وضع کیا جائے۔ جس سے ملت کا شیرازہ بکھرنے نہ پائے اور تمام مسلمان پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ رمضان کا پہلا اور آخری روزہ رکھیں

**شریعت کے احکام** اگر چاند کے بارے میں شریعت کے احکام کا استقصاء کیا جائے۔ تو حسب ذیل اصول سامنے آتے ہیں:۔

۱۔ قمری تقویم کی بنیاد رویت ہلال پر ہے نہ کہ افق کے اوپر ہلال کی موجودگی پر۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ اذا رأیتم الھلال فصوموا واذا رأیتموہ فافطروا (جب تم ہلال دیکھ لو تو رمضان کا آغاز کرو اور جب شوال کا چاند دیکھ لو تو روزے ختم کر دو) حضورؐ کا یہ ارشاد صحاح ستہ میں ہے اگرچہ اس مضمون کی ادائیگی میں الفاظ میں کسی قدر تفاوت ہے۔ اس کی روشنی میں گویا پہلی کا چاند وہ چاند قرار پاتا ہے جس کی عمر کم از کم اتنی ہو کہ وہ دوربین یا کسی آلے کی مدد کے بغیر دیکھا جائے۔

۲۔ مطلع صاف ہونے کی شکل میں صرف رویت ہلال معتبر ہے۔

۳۔ اگر مطلع ابر آلود ہو تو اس شکل میں حضورؐ سے دو اقوال مروی ہوئے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے ان غم علیکم فاکملوا العدۃ ثلاثین (اگر بادل چھائے ہوں تو تیس کی تعداد پوری کرو) دوسری حدیث میں ہے ان غم علیکم فاقدروا لہ (اگر بادل چھائے ہوں تو چاند کا حساب لگالو) ان دو اقوال کی موجودگی کے سبب سے، مطلع ابر آلود ہونے کی شکل میں چاند کا فیصلہ کرنے کے طریق کار میں فقہا کے مابین اختلاف ہوا ہے۔ اکثر فقہا پہلے قول کو اختیار کرتے ہیں اور دوسرے کو مجمل مانتے ہیں۔ لیکن بعض کے نزدیک اس صورت حال میں چاند کا حساب لگایا جائے گا۔ اگر حساب سے یہ معلوم ہو کہ چاند افق سے اتنا اونچا تھا کہ اگر بادل نہ ہوتے تو دکھائی دے دیتا تو اس حساب کے مطابق عمل کیا جائے گا۔ یہ مذہب ابن سریجؒ کی روایت کے مطابق امام شافعیؒ کا تھا۔ یہی مذہب مطرف بن الشخیرؒ کا بھی ہے جو کبار تابعین میں سے ہیں۔

۴۔ رمضان اور شوال کا چاند ہونے کے لئے دو گواہ ضروری ہیں۔ حضورؐ کا ارشاد ہے:۔ ان شھد شاھدان فصوموا وافطروا (اگر دو گواہ گواہی دیں تب روزہ رکھنا شروع

یا بس کرو) گواہوں کے لیے دو کی قید تو سنت سے ثابت ہے البتہ فقہا نے مطلع صاف ہونے کی شکل میں اس سے زیادہ گواہیاں طلب کرنے کو ترجیح دی ہے۔ خصوصاً عید الفطر کے لیے امام ابوحنیفہؒ رویت عامہ کو اس لئے ضروری قرار دیتے ہیں کہ اس موقع پر فساق و فجار کے لئے چاند کی جھوٹی گواہی دے کر رمضان کی پابندیوں سے آزاد ہونے کا ایک نفسیاتی داعیہ موجود ہوتا ہے۔

۵۔ اختلاف مطالع کا لحاظ ضروری ہے۔ صحاح کی ایک روایت ہے۔

"کریبؓ کہتے ہیں کہ ام الفضلؓ نے مجھے حضرت معاویہؓ کے پاس شام میں بھیجا۔ میں نے شام پہنچ کر ان کا کام کیا۔ وہیں رمضان کا چاند ہوگیا اور میں نے جمعہ کی رات کو چاند دیکھا۔ مہینے کے آخری دنوں میں میں مدینہ واپس آیا تو حضرت ابن عباسؓ مجھ سے شام کے حالات پوچھنے لگے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے پوچھا "تم لوگوں نے وہاں چاند کب دیکھا؟ میں نے بتایا کہ ہم نے تو جمعہ کی شب کو دیکھا تھا۔ کہنے لگے تم نے خود دیکھا؟ میں نے کہا۔ ہاں! میں نے بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ دیکھا اور اسی کے مطابق تمام لوگوں نے اور خود معاویہؓ نے روزہ رکھا۔ کہنے لگے ہم نے تو اسے شنبہ کی رات کو دیکھا، لہذا اب ہم روزے رکھتے جائیں گے یہاں تک کہ وہ تیس پورے ہو جائیں یا انتیس پر چاند نظر آجائے میں نے پوچھا کیا آپ معاویہؓ کی رویت اور ان کے روزوں کو کافی دلیل نہیں سمجھتے؟ کہنے لگے، نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہی حکم دیا ہے۔"

اس حدیث کے آخری جملے سے بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک شہر کی رویت دوسرے شہر کے لیے معتبر نہیں، خواہ ان کے درمیان فاصلہ کم ہو یا زیادہ لیکن اس کا یہ مفہوم درست نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حوالی مدینہ کے اعرابیوں کی شہادت چاند کے بارے میں قبول کرنا ثابت ہے حالانکہ مدینہ میں کسی کو چاند نظر نہیں آیا تھا۔ مزید برآں مذکورہ بالا واقعہ میں بھی ابن عباسؓ حضورؐ کے اس حکم سے استدلال اس وقت کر رہے ہیں۔ جب کہ معاملہ مدینہ اور بلاد شام کا ہے جن کے درمیان سینکڑوں میل کی مسافت حائل ہے۔ لہذا اس حدیث سے مراد یہ ہے کہ جن شہروں کے مابین فاصلہ اتنا ہو کہ ایک جگہ کا چاند دوسری جگہ نظر آنا ضروری نہ ہو۔ وہاں ایک جگہ کی رویت دوسرے مقام کے لیے نظیر نہیں بن سکتی۔

رہا یہ سوال کہ ایک مقام کی رویت کو کتنے فاصلے تک حجت بنایا جا سکتا ہے تو اس کا جواب مختلف فقہا نے مختلف طور سے دیا ہے۔ بعض کے نزدیک یہ فاصلہ زیادہ سے زیادہ اتنا ہونا چاہیئے کہ جس میں نماز کے قصر کی اجازت ہے۔ بعض کے نزدیک مملکت کے ہر صوبہ کی رویت الگ ہوگی۔ بعض کے نزدیک پہاڑی علاقوں اور میدانی علاقوں کا فرق اس بارے میں ملحوظ رکھنا ہوگا۔ ہمارے نزدیک اس فاصلہ کے تعین میں بھی عملاً کوئی زیادہ مشکل نہیں ہے بلکہ چند مہینوں تک لگاتار اگر یہ معلومات فراہم کی جائیں کہ ایک مملکت کے کن کن شہروں میں چاند ایک ہی دن نظر آتا ہے اور کن کن شہروں میں تاریخ مختلف ہو جاتی ہے تو اس مشاہدہ کے نتائج سے ملک کے مطالع کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ ان معلومات کی روشنی میں ایک ملک کو اگر دو یا تین منطقوں میں تقسیم کر دیا جائے تو ان منطقوں کے کسی ایک مقام کی رویت پورے منطقے کی رویت قرار دی جا سکتی ہے۔

**رویت ہلال کیلئے چند تجاویز**

رویت ہلال کے مذکورہ احکام صحیح احادیث سے مستنبط ہوتے ہیں اور اپنے مدعا میں بالکل واضح ہیں۔ فقہا کے مابین ان احکام کے نفاذ میں تو خفیف سا اختلاف ہوا ہے مگر اصولی طور پر سبھی کا ان پر اتفاق ہے۔ لہٰذا رویت ہلال کا طریق کار وضع کرتے وقت ان کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ پاکستان میں رمضان اور عیدین کی تاریخوں کے تعین کی ذمہ داری چونکہ مرکزی حکومت نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے اور علما کو اس کے اپنائے ہوئے طریق کار پر پورا اطمینان نہیں اس لئے ذیل میں چند تجاویز پیش کی جاتی ہیں جن کو اختیار کر کے احکام شریعت کا لحاظ رکھتے ہوئے رویت ہلال کا اہتمام کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ پاکستان کے محکمہ موسمیات کو تحقیق (ریسرچ) کے لئے دو موضوع فوری طور پر دے دیئے جائیں — ایک یہ کہ وہ پاکستان کے تمام بڑے شہروں — خصوصاً پشاور، راولپنڈی، لاہور ملتان، کوئٹہ، کراچی، ڈھاکہ اور چٹاگانگ میں سال بھر کے ہر قمری مہینے کے آغاز کی تاریخ کا سروے کرے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ان میں سے کن کن شہروں کے مابین رویت ہلال کے تفاوت کا امکان ہے۔ دوسرا یہ کہ ان جگہوں پر افق کے اوپر کم از کم کتنے منٹ رہنے والا چاند عام انسانی آنکھ کو نظر آ سکتا ہے۔ اس ریسرچ میں محکمہ جہاں اپنا انتظام کرے وہاں وہ عوام سے بھی رویت ہلال کی اطلاع فراہم کرنے کی اپیل کر سکتا ہے۔ عوام اس معاملے میں پوری دلچسپی لیں گے اور دین کے لئے حکومت کی اس تحقیق کو کامیاب کرنے کے

لئے پورا تعاون کریں گے۔

۲۔ رمضان، شوال اور ذوالحجہ کے شروع ہونے سے پہلے محکمہ موسمیات عوام کی رہنمائی کے لئے یہ اعلان کر دیا کرے کہ پیچیدہ مقامات میں چاند کے تقریباً کتنی بلندی پر، کس زاویے پر اور کتنی دیر کے لئے نظر آنے کی توقع ہے۔ اس رہنمائی کی ضرورت اس لئے ہے کہ عام لوگوں کو چاند دیکھنے کی فنی مہارت حاصل نہیں ہوتی اور انتیس کا چاند چونکہ قلیل وقت کیلئے افق کے اوپر رہتا ہے اور وہ حد درجہ باریک بھی ہوتا ہے اس لئے بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ لوگ غلط سمتوں میں اسے تلاش کرتے رہتے ہیں اور وہ چند منٹ کے بعد نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہوتا ہے۔

۳۔ رویت ہلال کے مقصد کے لئے مشرقی اور مغربی پاکستان کو الگ الگ منطقے قرار دیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں صوبوں کے درمیان ایک طویل مسافت حائل ہے اور ان میں چاند کی تاریخ کا اختلاف ہونا بعید از امکان نہیں۔ رویت ہلال کے موجودہ انتظام کے تحت جس میں دونوں صوبوں کو ایک اکائی سمجھا گیا ہے، یہ مضحکہ خیز صورت حال بھی پیش آسکتی ہے کہ مغربی پاکستان میں نظر آنے والے چاند کی بنا پر مشرقی پاکستان میں توعید کا اعلان کر دیا جائے لیکن درمیان میں بھارت کے مسلمان چاند نظر نہ آنے کے باعث روزہ سے ہوں — اس معاملہ میں البتہ یہ اصول وضع کیا جا سکتا ہے کہ مغربی پاکستان میں بادل کی وجہ سے اگر چاند نظر نہیں آیا لیکن مشرقی پاکستان میں نظر آگیا ہے تو مشرقی پاکستان کا چاند مغربی پاکستان پر حجت بن جائے گا کیونکہ یہ جغرافیائی اعتبار سے ممکن ہے۔

۴۔ محکمہ موسمیات کی تحقیق کے نتیجہ میں اگر یہ طے پا جائے کہ مغربی پاکستان میں بھی اختلاف مطالع موجود ہے تو مغربی پاکستان کو بھی دو منطقوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ چونکہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ پشاور ڈویژن میں مغربی پاکستان کے دوسرے علاقوں کی نسبت ایک دن پہلے چاند نظر آیا ہے اس لئے اس طرح کی تقسیم قرین مصلحت ہے۔ اگر چاند ایک منطقے میں نظر آیا اور دوسرے میں نہیں تو اس شکل میں رمضان یا عید کا فیصلہ اسی منطقے کے لئے کیا جائے جس کے کسی شہر میں چاند نظر آیا ہے۔

۵ ملک کے دونوں حصوں میں مطلع ابر آلود ہونے کی شکل میں محکمہ موسمیات کی اس تحقیق سے

فائدہ اٹھایا جائے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے یعنی یہ کہ اگر ابر نہ ہوتا تو چاند کن کن منطقوں میں نظر آسکتا تھا۔

اس بارے میں یہ حقیقت مدنظر رہنی چاہیئے کہ محکمہ موسمیات یا فلکیات کے ماہرین کی رائے چاند نظر آنے یا نہ آنے کے بارے میں عملاً بہت صحیح ثابت ہوئی ہے۔ خود گزشتہ عیدالفطر کے موقع پر لاہور سے اس محکمہ نے جو پیشین گوئی جاری کی تھی وہ یہ تھی کہ چاند انتیس رمضان کو اگرچہ افق پر موجود ہوگا لیکن اس کی عمر اس قدر کم ہوگی کہ لوگوں کو نظر نہ آسکے گا، اور فی الواقع ایسا ہی ہوا۔

۶۔ چاند کا فیصلہ اس کو دیکھنے والوں کی شہادتوں پر کیا جائے نہ کہ محض اس کے دیکھے جانے کی خبر پر۔ مثال کے طور پر اس وقت یہ ممکن ہے کہ کسی مقام کے کچھ لوگ مرکزی رویت ہلال کمیٹی کو یا ڈپٹی کمشنروں کو فون پر کہہ دیں کہ فلاں مقام پر چاند دیکھ لیا گیا ہے تو ان کی اس اطلاع پر کوئی فیصلہ کرلیا جائے اگرچہ یہ اشخاص نامعلوم ہوں اور غلط اطلاع دے رہے ہوں۔ شہادت کے نظام میں چونکہ لوگوں کا تعین ہوجاتا ہے اور جھوٹی شہادت کی شکل میں ان کا مواخذہ کیا جاسکتا ہے اس لئے یہ نظام اس قابل ہے کہ اس کو اختیار کیا جائے۔

۷۔ مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے تحت ہر منطقے میں دو دو تین تین کمیٹیاں قائم کی جائیں تاکہ وہ اپنے سامنے گواہوں کی شہادت لے سکیں اور اس کی اطلاع مرکزی کمیٹی کو دیں جو مختلف منطقوں کی اطلاعات کی روشنی میں اپنا فیصلہ صادر کرے۔

۸۔ یہ یقین حاصل کرنے کے لئے کہ جو اطلاعات مرکزی کمیٹی کو موصول ہورہی ہیں وہ ذیلی کمیٹیوں کے حقیقی ذمہ دار لوگوں کی طرف سے ہیں، یہ طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے کہ مرکزی کمیٹی ایک کانفی ڈنشل سرکلر میں ان کمیٹیوں کے لئے اطلاع دینے کے مخصوص کوڈ (CODE) وضع کردے اور تمام اطلاعات انہیں کوڈ ورڈز میں فراہم کی جائیں۔

۹۔ ریڈیو پر مرکزی رویت ہلال کمیٹی کا فیصلہ اس کے کسی ذمہ دار رکن کی زبان سے نشر ہو۔

ہمارے نزدیک مذکورہ تجاویز رویت ہلال کے شرعی احکام کے مدعا

**ایک سوال کا جواب** کو پورا کرنے کے لئے بالکل کافی ہیں۔ لیکن ان کی روشنی میں کبھی کبھی ملک میں دو عیدیں ہوجایا کریں گی مثلاً ایک دن مغربی پاکستان میں اور دوسرے دن مشرقی

پاکستان میں یا بسا اوقات مغربی پاکستان کے ایک منطقے میں ایک دن اور باقی ملک میں دوسرے دن عید ہو گی۔ عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ دو عیدوں سے ملک کی یکجہتی کو نقصان پہنچتا ہے اس لئے پورے ملک کے لئے عید ایک ہی روز ہونی چاہیئے ہمارے نزدیک اس بارے میں حسب ذیل باتیں پیش نظر رہنی چاہئیں۔

**پہلی** یہ کہ ملک کی یکجہتی اور ملت کے اتحاد و اتفاق میں رخنہ ڈالنے والی اصل چیز یہ ہے کہ ایک ہی شہر میں نصف آبادی ایک دن عید کرے اور باقی آبادی دوسرے دن کرے۔ پاکستان کے ایک حصے میں ایک دن اور باقی حصے میں دوسرے دن عید کرنے کی شکل میں افتراق و انتشار کا کوئی عملی مظاہرہ نہ ہو سکے گا۔

**دوسری** یہ کہ ملک کے دو حصوں میں ایک دن کے فرق سے چاند نظر آنے کا امکان ایک جغرافیائی اور سائنسی حقیقت ہے۔ اس حقیقت کو نظر انداز کر کے کوئی قدم اٹھانا البتہ ایک غیر سائنسی اقدام ہے۔

**تیسری** یہ کہ سائنسی بنیاد پر دو عیدیں منانا مملکت کی وسعت اور قوم کی برومندی کی دلیل ہے۔ خدا کے اس انعام پر اس کا شکر ادا کرنے کی یہ بھی ایک شکل ہے کہ اگر ملک کے دو حصوں میں چاند دو مختلف دنوں میں نظر آتا ہے تو قوم خدا کے آگے دونوں دن سربسجود ہو اور دو عیدیں منائے۔

**چوتھی** یہ کہ ایک مملکت میں ایک ہی دن عید منانا شرعی نقطۂ نظر سے بھی مطلوب نہیں ہے۔ اگر غیر فطری اتحاد کا کوئی مظاہرہ شریعت میں مطلوب ہوتا تو عالم اسلام کے تمام مسلمانوں کے لئے ایک ہی عید کرنا واجب قرار دے دیا جاتا۔ اس کے برعکس عہد معاویہؓ کی جو حدیث اوپر بیان کی گئی ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دورِ صحابہؓ میں اس بات کا ہرگز کوئی اہتمام نہیں کیا گیا کہ عالم اسلام میں ایک ہی دن عید منائی جائے۔ اگر یہ کہا جائے کہ عالم اسلام کی وسعت کے پیش نظر ایسا کرنا ممکن نہ تھا تو اسی دلیل سے ایک وسیع مملکت میں دو عیدیں کرنا کیوں خلاف عقل قرار دیا جائے؟

**پانچویں** یہ کہ عملاً ہر مسلمان ریاست کا اپنا اپنا رویت ہلال کا انتظام ہے اور بسا اوقات دو ہمسایہ ریاستوں میں عید مختلف دنوں میں کی جاتی ہے۔ اگر سیاسی تقسیم کی بدولت دو دن کی عید منانے میں کوئی قباحت نہیں سمجھی جاتی تو جغرافیائی بنیاد پر پیدا ہونے والی ایسی صورت

امین احسن اصلاحی

# مسلمان نوجوانوں کے فرائض

[ایک تقریر جو پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات میں اساتذہ، طلبہ اور طالبات کے سامنے کی گئی]

حضرات اساتذہ اور عزیز طلبہ وطالبات!

میں آپ کی اس ذرہ نوازی کے لیے شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنی اس علمی مجلس میں مجھے تقریر کی دعوت دی۔ میں نے آپ کے نمائندوں سے معذرت کر دی تھی کہ میں کوئی تقریر تو نہیں کروں گا البتہ آپ کے تجویز کردہ عنوان پر کچھ متفرق باتیں طلبہ وطالبات کے سامنے عرض کر دوں گا۔ تقریر کا معاملہ یہ ہے کہ نوجوانی میں تو آدمی تقریر شوقیہ کرتا ہے، ادھیڑپن میں فرائض اور ذمہ داریوں کے تحت یہ کام کرنا پڑتا ہے لیکن بڑھاپے میں آکر یہ چیز بوجھ بن جاتی ہے۔ میرا حال یہ ہے کہ میں جوانی میں بھی اس ذمہ داری سے گھبراتا رہا ہوں۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اب اس دور میں میرے لئے یہ کام کتنا مشکل بن گیا ہوگا۔

بہرحال آپ کے دل رکھنے کے لئے کچھ باتیں کہوں گا۔ آپ ان کو نصیحت کے طور پر سمجھیے۔ میں اگرچہ اپنے آپ کو نصیحت و موعظت کا اہل نہیں سمجھتا لیکن آدمی کو بعض حقوق مجرد اس بنیاد پر حاصل ہو جاتے ہیں کہ اس کے بال سفید ہو چکے ہیں۔ مجھے بھی 'بزرگی بعقل است' والی بزرگی چاہے حاصل نہ ہوئی ہو لیکن 'بزرگی بسال' والی بزرگی تو بہرحال حاصل ہے۔

نصیحت و حکمت کا معاملہ یہ ہے کہ اگر سننے والوں کے دل نصیحت پذیر ہوں تو اس بات سے کچھ زیادہ فرق پیدا نہیں ہوتا کہ خود نصیحت کرنے والا واعظ بے عمل ہے یا ناصح باعمل۔ سعدی کی وہ حکایت شاید آپ کو یاد ہو کہ "از لقمان پرسیدند کہ حکمت از کہ آموختی؟ گفت از نادانان" لقمان سے پوچھا گیا کہ تم نے حکمت کس سے سیکھی؟ اس نے جواب دیا کہ نادانوں سے۔ میں یہی توقع آپ سے رکھتا ہوں۔

نوجوانوں کے فرائض سے متعلق مجھے آپ کے سامنے کوئی نئی بات نہیں کہنی ہے میں

بھی وہی بات کہوں گا جو بہتوں کی زبانی آپ نے سنی ہوگی۔ بعض باتیں بڑی اہم اور بڑے نکتے کی ہوتی ہیں لیکن وہ ہر مجلس میں بار بار دہرائے جانے کے سبب سے بالکل پامال اور فرسودہ بن کر رہ جاتی ہیں۔ اس وجہ سے سننے والے ان کو کما حقہٗ اہمیت نہیں دیتے۔ یہ صورت حال بڑی افسوسناک ہے۔ اس طرح ہماری زندگی کے بہت سے بنیادی حقائق نے اپنی اصلی معنویت بالکل کھو دی ہے۔ لیکن حضرات، حقیقت بہرحال حقیقت ہے، اس کو اس کی اصلی قدر و قیمت سے اس لئے محروم نہیں کیا جاسکتا کہ اس کو بہتوں نے بیان کیا ہے یا بہت سے بیان کرنے والوں نے محض رسماً بیان کیا ہے۔

میرے نزدیک انہی مظلوم حقیقتوں میں سے یہ حقیقت بھی ہے کہ ہر قوم کے مستقبل کا انحصار اس کے نوجوانوں پر ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ دنیا کی عظیم سچائیوں میں سے ایک عظیم سچائی ہے۔ خواہ ہم اس کی قدر کریں یا نہ کریں۔ قومیں اپنے رقبوں، اپنی عمارتوں، اپنے باغوں اور چمنوں، اپنے دریاؤں اور پہاڑوں سے باقی نہیں رہتی ہیں بلکہ اپنی آئندہ نسلوں اور اپنے نوجوانوں سے باقی رہتی ہیں۔ نوجوان اچھے ہوں تو قوم زندہ رہے گی۔ اگر اس کے پاس دریا اور پہاڑ نہ ہوں گے تو وہ اپنے لئے نئے دریا اور نئے پہاڑ پیدا کرلے گی۔ برعکس اس کے نوجوان مردہ ہوں تو اشبیلیہ، غرناطہ اور قرطبہ کی عظمتیں تعمیر کرنے والے بھی صرف تاریخ کی ایک داستان عبرت بن کے رہ جاتے ہیں۔

یہی نکتہ ہے کہ دنیا کی ہر زندہ رہنے والی قوم نے سب سے زیادہ اہمیت اپنے نوجوانوں کی اصلاح و تربیت کو دی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جن قوموں کو یہ بات عزیز ہوئی ہے کہ صفحۂ عالم پر ان کا مادّی وجود بھی قائم رہے اور ان کی معنوی ہستی بھی کارفرما رہے انہوں نے اپنے بام و در کی آرائش کے بجائے اپنے آگے آنے والے اخلاف کی تہذیب و تربیت کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ میں تاریخ کا طالب علم نہیں ہوں لیکن اسپارٹا کے لوگوں سے لے کر آج تک کی قابلِ ذکر قوموں کے جو حالات سرسری طور پر معلوم ہوئے ہیں، ان کی بنا پر یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہتا ہوں کہ رومی و یونانی ہوں یا انگریز و امریکن، دنیا کے نقشے پر کوئی پائدار نقش اسی قوم نے چھوڑا ہے جس نے اپنی آنے والی نسل کی فکر کی ہے۔ اسپارٹا والوں کے متعلق میں نے کہیں پڑھا ہے کہ وہ اپنی عمارتوں میں کوئی تراشا ہوا پتھر لگانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ ان کا تصور یہ تھا کہ عمارتوں میں تراشے ہوئے پتھر لگانا قوم کے اندر تن آسانی اور تعیش پسندی کے رجحان کی دلیل ہے اسی

طرح اپنی آئندہ نسلوں کی صحت مندی کے معاملے میں میں نے سُنا ہے کہ وہ اس قدر حساس تھے کہ اس کے لئے انہوں نے بعض ظالمانہ طریقے بھی اختیار کر لئے تھے مثلاً یہ کہ وہ کمزور بچوں کو سرے سے زندہ ہی نہیں رہنے دیتے تھے۔

ہمارے ہاں یعنی اسلام میں اولاد کی اصلاح و تربیت کا جو اہتمام رہا ہے اس کے لئے دوسری چیزوں سے قطع نظر کر کے اگر صرف قرآن ہی پر نظر ڈالئے تو اس کی اہمیت واضح کر دینے کے لئے وہ کافی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی وصیت اپنی اولاد کو، حضرت اسحٰقؑ و حضرت یعقوبؑ کی وصیت و نصیحت اپنی ذریت کو، لقمان کی تلقین اپنے بیٹے کو۔ یہ ساری سرگذشتیں اسی لئے بیان ہوئی ہیں کہ ہم ان سے یہ سبق حاصل کریں کہ اچھے اسلاف کے نام اور کام اچھے اخلاف ہی سے باقی رہتے ہیں۔ حضرت نوحؑ کی سرگذشت پڑھیئے تو دل تڑپ تڑپ جاتا ہے کہ ان کو اپنے بیٹے کی نااہلی کا کتنا غم تھا اور انہوں نے اس کی اصلاح و تربیت کے لیے کیا کیا زحمتیں اٹھائیں اور کس کس طرح اپنے رب کے آگے آہ و فغاں کی۔

حضرات! یہ چیز بالکل فطرت انسانی ہے۔ افراد ہوں یا قومیں ان کا مادی اور معنوی وجود ان کے اخلاف ہی کے واسطے سے باقی رہتا ہے اور اس بقا کی خواہش ایک امر فطری ہے جس قوم کے اندر یہ خواہش مردہ ہو جاتی ہے یا اس کے لیے جو اہتمام مطلوب ہے وہ اس کے اندر باقی نہیں رہتا تو وہ قوم دنیا کے نقشے سے مٹ جاتی ہے۔

اس وجہ سے مبارک ہے وہ قوم جس کے ذمہ دار اجتماعی بقا کے اس رمز سے آشنا ہیں اور وہ آنے والی نسل کو ان عظیم ذمہ داریوں کے لیے تیار کر رہے ہیں جو ان کے کندھوں پر آنے والی ہیں لیکن عزیز طلبہ اور طالبات! میں یہاں اجتماعیات کے ایک اور رمز سے بھی آپ کو آگاہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ کہ مستقبل کی ذمہ داریاں بہرحال آپ کے کندھوں پر آنے والی ہیں اور مستقبل آپ کو اپنے باٹ اور اپنی ترازو سے تولے گا۔ وہ اس معاملے میں کسی رو رعایت اور کسی عذر و معذرت کے قبول کرنے کا روادار نہ ہوگا۔ اگر آپ اپنی ذمہ داریوں کے لیے نااہل ثابت ہوں گے تو وہ اس بنا پر آپ کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کریگا کہ آپ کے پچھلوں نے آپ کے معاملے میں اپنی ذمہ داریاں کماحقہٗ ادا نہیں کیں۔ انہوں نے ادا کیں یا نہیں کیں؟ یہ سوال خارج از بحث ہو جائیگا۔ کسوٹی پر آپ ہوں گے نہ کہ ہم۔ فیصلہ آپ کی اہلیت و نااہلیت کا ہوگا نہ کہ ہماری۔ جواب دہ آپ ہوں گے نہ کہ آج کے لوگ۔ اگر آپ نااہل ثابت ہوں گے تو زمانہ آپ کے

خلاف بے لاگ فیصلہ سنا دیگا۔ اور دنیا کے نقشے سے آپ کا وجود مٹ جائے گا۔ تِلْكَ أُمَّةٌ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ۔

اگر آپ یہ محسوس بھی کرتے ہیں کہ آج آپ کے ذمہ دار آپ کے حق کو صحیح طور پر نہیں ادا کر رہے ہیں جب بھی آپ اپنے فرض کو پہچاننے کی کوشش کریں اور مستقبل میں اپنے بل بوتے پر اپنی بازی جیتنے کی تیاریاں کریں۔ لائق اولاد باپ کی کمزوریوں کو اپنی کمزوریوں کے لئے عذر نہیں بناتی بلکہ اپنی محنت و قابلیت سے اپنا نام بھی روشن کرتی ہے اور باپ کا نام بھی۔

عزیز طلبہ و طالبات! اگر آپ میرا نقطۂ نظر اچھی طرح سمجھ گئے ہیں تو اب میں آگے بڑھتا ہوں اور یہ عرض کرتا ہوں کہ قوم کی خلافت و وراثت سنبھالنے کے لیے آپ کا مقدم فرض یہ ہے کہ آپ اپنے آپ کو ہر اعتبار سے صحت مند اور تندرست نسل بنانے کی کوشش کریں۔

ہر اعتبار سے صحت مند اور تندرست بنانے کا مطلب یہ ہے کہ جسمانی، عقلی اور ایمانی و اخلاقی تینوں ہی اعتبارات سے۔ جب تک ان تینوں ہی اعتبارات سے ہمارے نوجوان تندرست نہ ہوں اس وقت تک نوجوانوں کے اندر فتوت پیدا نہیں ہو سکتی اور جب تک ان کے اندر فتوت نہ پیدا ہو اس وقت تک وہ اس ملت کی خلافت و وراثت کے حامل ہونے کے اہل نہیں ہو سکتے جس کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی قوموں کی امامت کے منصب پر مامور فرمایا ہے۔ اب میں بالاختصار صحت کے ان تینوں پہلوؤں پر کچھ باتیں آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔

**صحت جسمانی**

جسمانی صحت کی اہمیت میرے نزدیک اس پہلو سے نہیں ہے کہ آپ کوئی بین الاقوامی شہرت حاصل کرنے والے پہلوان یا گھونسہ باز بن جائیں۔ میں سانڈ اور کتے کی صحت پر گفتگو نہیں کر رہا ہوں بلکہ انسان کی صحت پر گفتگو کر رہا ہوں۔ انسان کے لئے صحت جسمانی کی اہمیت اس پہلو سے ہے کہ یہ چیز عقلی اور اخلاقی صحت کے لیے بمنزلہ بنیاد ہے۔ عقل کے نشوونما اور اعلیٰ اخلاق و ایمانی تقاضے پورے کرنے کے لیے جسمانی صحت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ کمزور، مریض اور ناتواں جسم کے اندر عقل بھی مریض و ناتواں ہوتی ہے اور ضعیف الاعضاء اور ضعیف القویٰ لوگ ایمانی و اخلاقی تقاضے بھی پورے کرنے میں ضعیف ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ لازم نہیں کہ جس کا جسم تندرست ہو اس کی عقل اور اس کا اخلاق بھی تندرست ہو۔ بہت سے لوگ جسماً بڑے تندرست ہوتے ہیں لیکن عقلی اور اخلاقی اعتبار سے بالکل احمق اور سفلہ ہوتے ہیں تاہم یہ بات اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے کہ عقلی و اخلاقی تندرستی کے لئے جسمانی

تندرستی بھی ضروری ہے۔

میں کوئی طبیب یا ڈاکٹر نہیں ہوں۔ اور نہ میرے پیش نظر اس وقت صحت کے لوازم و شرائط پر کوئی خطبہ دینا ہے۔ میں ایک عام آدمی کی حیثیت سے جانتا ہوں کہ جسمانی صحت کے لیے چند چیزیں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کا اہتمام حتے الامکان ہر شخص کے لیے ضروری ہے۔

سادہ اور ستھری غذا

تازہ اور صاف ہوا

محنت اور ورزش

ضبطِ نفس

جہاں تک سادہ اور ستھری غذا کا تعلق ہے، اس کا اہتمام اگر آپ کے لیے بہت آسان نہیں تو زیادہ مشکل بھی نہیں ہے بشرطیکہ آپ غذائیات کے متعلق کچھ علم اور تجربہ حاصل کرلیں اور اس کے لئے کچھ زحمت اٹھانے اور کچھ اہتمام رکھنے کی اپنے اندر عادت پیدا کرلیں۔ آپ اس بات سے واقف ہوں گے کہ صحت کے لیے نہ بہت قیمتی غذا کی ضرورت ہے، نہ اس کے لیے تنوعات اور چٹخاروں کی احتیاج ہے۔ اگر آپ غیر ضروری اور مضر صحت چیزوں کا استعمال ترک کر دیں اور چٹخاروں کے درپے نہ ہوں تو آپ میں سے ہر شخص اگر نہیں تو اکثر لوگ بآسانی اپنے لیے صاف ستھری غذا کا اہتمام کر سکتے ہیں اور اگر آپ سادہ غذا اور سادہ لباس کو جماعتی حیثیت سے اختیار کرنے کا اپنے اندر ولولہ پیدا کریں تو آپ اس کو فیشن کی حیثیت بھی دے سکتے ہیں اور اس سے ہر شخص کی مشکل آسان ہو سکتی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم کھانا تو مغلوں کے دور زوال کا پسند کرتے ہیں اور لباس انگریزوں اور امریکیوں کے دور زوال کا۔ ہماری یہ زوال پسندی ہمارے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ آپ لوگوں نے تو تاریخ پڑھی ہے آپ کو تو معلوم ہوگا کہ مغلوں نے ایوانِ نعمت کے یہ دستر خوان جس وقت بچھائے ہیں یہ تاریخ کا وہ منحوس دور ہے جب انہیں دلی کا لال قلعہ انگریزوں کے لیے خالی کر دینا پڑا۔ اس دستر خوان کے ساتھ ان کی حکومت کی بساط بھی الٹ گئی۔ جس دور میں انہوں نے یہ تمام ممالک فتح کئے ہیں اس دور میں وہ ان لذات سے ناآشنا تھے۔ اس زمانے میں تو ان کے نوجوانوں کا یہ حال تھا کہ وہ خشک گوشت کے ٹکڑے اپنے گھوڑوں کی زین کے نیچے رکھ لیتے۔ جب وہ گھوڑے کے پسینے سے کچھ نرم ہو جاتے تو جہاں بھوک لگتی اس کو چاب لیتے۔ اس غذا نے ان کے اندر یہ طاقت پیدا کی کہ جدھر کا انہوں

نے رُخ کیا اُدھر کی دنیا الٹ دی۔ کم و بیش یہی حال انگریزوں کا بھی رہا ہے۔ جس دور میں انہوں نے تمام دنیا کو زیر نگیں کیا ہے ان کے نوجوانوں کی سخت جانی و سخت کوشی مثالی رہی ہے۔ یہ دَور توان کے زوال کا دَور ہے اور یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم اس کو ان کی ترقی کا دور سمجھتے ہیں۔

صاف ستھری ہوا کے لیے آپ صبح خیزی کی عادت پیدا کیجئے۔ صبح خیزی کی عادت ہمیشہ سے بیدار بخت لوگوں کی عادت رہی ہے۔ آپ کو علامہ اقبالؒ کا وہ شعر یاد ہوگا جس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ جس سحر سے شبستان وجود لرزتا ہے وہ طلوع آفتاب سے نہیں پیدا ہوتی بلکہ مومن کی اذان سے پیدا ہوتی ہے۔ اس اذان سے دنیا کو آپ ہی نے آشنا کیا لیکن اب آپ خود اس کی لذتوں سے ناآشنا ہو گئے۔ سویرے اٹھئے، دوسروں کو خواب غفلت سے جگائیے۔ خالق کائنات کی بندگی کیجئے۔ اور پھر کھلے میدانوں اور چمنستانوں میں جن کی آپ کے اس شہر میں کمی نہیں ہے، سیر کیجئے اور تازہ ہوا کا لطف اٹھائیے!

ورزش اور محنت کا مقصود اپنے آپ کو سخت کوش اور سخت جان بنانا ہے تاکہ آپ چاق و چوبند رہیں، سردی اور گرمی کو برداشت کر سکیں، بھوک پیاس کا مقابلہ کر سکیں، وقت پڑنے پر سخت سے سخت مشقت جھیل سکیں۔ بہترین ورزش وہ ہے جو آدمی کو میدان جنگ کی سختیوں کے لئے تیار کرے۔ ہمارے اسلاف میں اسی قسم کی ورزش کا ذوق و شوق تھا۔ آپ بھی اپنے اندر اس کا شوق پیدا کیجئے۔ نزاکت عورت کے لئے حسن ہے لیکن نوجوانوں کیلئے اس سے بڑا کوئی عیب نہیں۔

ضبط نفس، صحت کے نہایت اہم لوازم میں سے ہے جب تک آپ اپنی خواہشات، اپنے جذبات اور اپنی شہوات پر کنٹرول کرنا نہیں سیکھیں گے اس وقت تک ان تمام تدبیروں کے باوجود بھی، جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے آپ حقیقی صحت نہیں حاصل کر سکیں گے۔ اس زمانے میں ایسے نوجوان بہت کم نظر آتے ہیں جن کے چہروں پر فتوت کا جمال نظر آتا ہو۔ معاف کیجئے گا میں آپ پر کوئی طعن نہیں کر رہا ہوں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اس زمانے میں نوجوانوں کو دیکھئے تو عام طور پر چہرے کملائے ہوئے، آنکھیں دھنسی ہوئی، رنگ اڑے ہوئے، گال پچکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کا سبب صرف یہ نہیں ہے کہ اس زمانے میں غذا خالص نہیں مل رہی ہے بلکہ اس میں بڑا دخل ہے نگاہ کی آوارگی، دل کی ہرزہ گردی اور جذبات و خواہشات کی بے راہ روی کو اور یہ چیزیں وہ ہیں جو نہ صرف غارت گر اخلاق و دین و ایمان ہیں بلکہ غارت گر حسن و

صحت بھی ہیں۔ آپ اگر اپنے جذبات وخواہشات کو ضبط میں رکھنا سیکھ جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ نانِ جویں کھا کر بھی آپ کے چہروں پر اس جمال فتوت کا عکس نظر آئے گا جو علیؓ مرتضیٰ کے چہرے پر تھا۔

حضرات ـــــ میں جس جمال کا ذکر کر رہا ہوں اس کا تعلق جسم کی جلد اور اس کے رنگ و روغن سے نہیں ہے بلکہ اس کا منبع باطن کی صحت ہے۔ جس کے باطن میں صحت ہوتی ہے وہ ضابطِ نفس ہوتا ہے۔ قرآن میں اس کے لیے "حصور" کا لفظ آیا ہے۔ اس صفت کے مدارج ومراتب ہیں لیکن باطن میں یہ نور اسی صفت سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ نور حضرت مریمؑ اور حضرت یحییٰؑ کی وراثت ہے۔ جس کے اندر اس نور کی کوئی جھلک ہوگی اس کی چمک اس کی پیشانی کے افق پر نظر آئے گی اور خوش قسمت ہے وہ نوجوان جو اس جمال یوسفی میں سے کوئی حصہ پائے۔ جن پیشانیوں پر اس جمال کی کوئی کرن ہوتی ہے اگر ان کا رنگ کالا بھی ہو تو وہ رشکِ آفتاب وماہتاب ہوتی ہیں۔

حضرات! ـــ اصلی روحانی طاقت کا خزانہ بھی اسی ضبطِ نفس کے اندر ہے۔ جو اپنے نفس سے شکست کھا جاتا ہے وہ ہر ایک سے مار کھا جاتا ہے۔ برعکس اس کے جو اپنے نفس پر فتح پا جاتا ہے وہ ہر میدان میں شیطان کو زیر رکھتا ہے۔ ایک حدیث میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تم میں پہلوان وہ نہیں ہے جو دوسروں کو پچھاڑ لے بلکہ اصلی پہلوان وہ ہے جو اپنے نفس کو پچھاڑ لے۔

**صحتِ عقلی** حضرات! عقلی صحت کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ ماضی وحاضر کے عقلی وفکری اندوختوں سے فائدہ اٹھائیں اور پھر اپنی عقل کو کام میں لا کر اس اندوختہ میں اگر کچھ اضافہ کر سکیں تو اضافہ کریں۔ انسانیت کا اصل خزانہ درحقیقت یہی عقلی وفکری خزانے ہیں۔ اسی کے تحفظ، بقا اور ترقی کے لیے یہ کالج، یونیورسٹیاں، لائبریریاں اور تجربہ گاہیں قائم ہیں اور آپ درحقیقت اسی لیے اس جامعہ میں جمع ہوئے ہیں کہ آپ اپنی عقل کو درست کریں۔

عقل انسان کے اندر خدا کا بخشا ہوا نور ہے۔ یہی چیز انسان کو حیوان سے ممیز کرتی ہے۔ دنیا میں ساری بہار اسی کی لائی ہوئی ہے۔ انسانیت کے گل سرسبد وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنی عقلوں کو استعمال کیا اس لیے کہ آج انسانیت کے اندوختہ میں جو کچھ بھی ہے انہی کا عطیہ ہے۔ ان دانشوروں اور عاقلوں کی کوشش سے ہمارے علوم میں اب اتنا اضافہ ہو گیا ہے

کہ کسی ایک انسان کے بس میں یہ نہیں ہے کہ ان سب کا احاطہ کر سکے۔ اگر آپ اپنی تمام توانائیاں صرف کر دیں تو زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ کسی ایک فن میں آپ کمال حاصل کر لیں۔ میرے نزدیک آج علم میں ادنیٰ درجہ یہی ہے کہ آپ کسی ایک فن میں کمال حاصل کر لیں اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ آپ اس فن میں درجہ کمال سے آگے بڑھ کر درجہ اجتہاد حاصل کر لیں تاکہ آپ اس فن پر کچھ اضافہ کر کے اپنے بعد والوں کے لیے کوئی علمی وراثت چھوڑ سکیں۔ دنیا ہر لمحہ ترقی کی طرف جا رہی ہے۔ اس کی ہم قدمی کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے نوجوان اس علمی و عقلی جدوجہد میں کسی سے پیچھے نہ رہیں ورنہ انہیں ہر میدان میں پیچھے رہنا پڑے گا۔

اگر آپ میری اس بات کی اہمیت اچھی طرح سمجھ گئے ہیں تو لازم ہے کہ آپ دو باتوں کا اہتمام کریں —

ایک اس بات کا کہ آپ اپنے اوقات کا لمحہ لمحہ اعلیٰ قدر و قیمت رکھنے والی علمی و فنی چیزوں کے مطالعہ پر صرف کریں۔ ادنیٰ درجے کی چیزوں پر اپنا وقت ضائع کرنا اپنے اوپر حرام قرار دے لیں۔ تیسرے درجہ کی چیزیں تو درکنار، دوسرے درجے کی چیزیں بھی آپ کے لیے اضاعت وقت کے حکم میں داخل ہیں۔ اس زمانے کے نوجوانوں کو جب میں سرسری، سطحی، عامیانہ — اور مزخرف چیزیں پڑھتے دیکھتا ہوں تو مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے۔ ناقص اور بے مغز چیزیں پڑھنا فاسد اور مسموم غذا سے زیادہ انسان کے لیے مہلک ہے۔ اس زمانے میں پریس کی سہولت نے جس طرح علوم کے انبار لگا دیئے ہیں اسی طرح خرافات کے بھی انبار لگا دیئے ہیں اور بدقسمتی سے ہمارے نوجوان اسی دوسری قسم کے انبار سے زیادہ رغبت رکھتے ہیں۔ اس پر مزید ستم یہ ہے کہ اس زمانے میں وہ لٹریچر بھی بہت بڑی مقدار میں شائع ہو رہا ہے جو مولانا حالیؒ کے الفاظ میں "عفونت کے لحاظ سے سنڈاس سے بھی بدتر ہے"۔ اس قسم کی چیزیں کسی قوم کے نوجوان اس زمانے میں پڑھتے ہیں جب اس قوم کی موت کا وقت قریب ہوتا ہے۔ آپ اپنی قوم کے لیے موت کے بجائے زندگی کے پیغام بر بنیں۔ اس معاملے میں آپ یورپ اور امریکہ کی قوموں کی ریس نہ کریں۔ قومی عروج و زوال کے فلسفہ کی رو سے اب ان قوموں کا دم واپسیں ہے۔

دوسری اس بات کا اہتمام آپ کے لیے ضروری ہے کہ اس فکری و عقلی تربیت کے دور میں آپ اپنے دائرہ کے باہر کے سیاسی معاملات و مسائل میں عملاً کوئی حصہ نہ لیں۔ اس دور میں آپ ان میں عملاً کوئی حصہ لینے کے بجائے ان میں حصہ لینے کی اپنے اندر پختہ قابلیت

پیدا کریں۔ کل ساری ذمہ داریاں آپ کے سر پر آنے والی ہیں۔ آپ ہی یونیورسٹیوں اور کالجوں کو سنبھالیں گے۔ آپ ہی اخباروں کے ذمہ دار ہوں گے۔ آپ ہی عدالتوں اور کچہریوں میں ہوں گے۔ آپ ہی قوم کے لیڈر، اسمبلیوں کے ممبر، صوبوں کے گورنر، ملک کے صدر اور باہر کے ملکوں میں ملک کے نمائندے اور سفیر ہوں گے۔ اونچی سے اونچی کرسی پر آپ ہی بیٹھیں گے اور ملک و قوم کی باگ آپ کے ہاتھ میں ہوگی۔ ان ذمہ داریوں کے لیے آپ اپنے آپ کو تیار کریں۔ یہ تیاری کوئی آسان کام نہیں ہے کہ آج آپ کو پرائے جھگڑوں میں ٹانگ اڑانے کا موقع نکل سکے۔ آپ کو کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ سیاست میں کوئی حصہ ہی نہ لیں۔ ضرور حصہ لیں لیکن یہ حصہ لینا فکری و نظری نوعیت کا ہو۔ آپ اپنے ملک کے معاملات و مسائل کو اچھی طرح سمجھیں، ان کے حل سوچیں اور ان کے لیے اپنے کو تیار کریں لیکن ان میں عملی مداخلت نہ کریں۔ خام کاروں کی مداخلت معاملات کو سنوارتی نہیں بلکہ بگاڑتی ہے۔ مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ "بعض لوگ پکنے سے پہلے سڑ جایا کرتے ہیں" غالباً ان کا اشارہ ایسے ہی لوگوں کی طرف رہا ہوگا جو قبل از وقت اپنے آپ کو رموز مملکت کا ماہر سمجھنے لگتے ہیں اور قوم کے معاملات کو حل کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ پکنے سے پہلے سڑنے کی کوشش نہیں کریں گے۔

## ایمانی و اخلاقی صحت

عزیز طلبہ و طالبات! اب میں چند باتیں ایمانی و اخلاقی صحت سے متعلق عرض کروں گا۔

سب سے پہلے اس بات کو یاد رکھیے کہ ایمانی و اخلاقی صحت عقلی صحت سے کوئی علیحدہ شے نہیں ہے بلکہ یہ اسی کا تکملہ اور تتمہ ہے۔ جس طرح عقل، انسانیت کا نور ہے اسی طرح ایمان عقل کا نور ہے۔ جس طرح انسان کو حیوان سے ممیز کرنے کیلئے خدا نے عقل عطا فرمائی ہے اسی طرح عقل کو جلا دینے کے لیے خدا نے ایمان کی روشنی عطا فرمائی ہے۔ عقل بڑی نعمت ہے لیکن اس میں یہ نقص بھی ہے کہ وہ بسا اوقات اسی دنیا کی فانی اور محدود لذتوں اور کاوشوں میں گھر کے رہ جاتی ہے جس کے سبب سے وہ ان حقائق کو نہیں دیکھ پاتی جن پر انسانی زندگی کی ابدیت کی بنیادیں ہیں۔ یہ کوتاہی ایک بڑی خطرناک کوتاہی ہے اس کے سبب سے انسان کا زاویۂ نگاہ بہت تنگ، اس کے حوصلے بہت پست، اس کی چاہتیں بالکل مادی اور سفلی اور اس کے اخلاقی کی اقدار بالکل خود غرضانہ اور مفاد پرستانہ ہو کے رہ جاتے ہیں۔

عقلِ انسانی کو اس دلدل سے نکالنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے وحی کا نور بھیجا ہے جو دنیا کو حضرات انبیا علیہم السلام کے ذریعہ سے ملا ہے۔ یہ نور عقل انسانی کی رہنمائی ابدیت کی منزلوں کی طرف کرتا ہے اور اس کو اس معراج پر پہنچاتا ہے جہاں فرش اور عرش دونوں کے ڈانڈے مل جاتے ہیں۔ یہاں انسان اپنی حقیقی قدر و قیمت سے آشنا ہوتا ہے۔ اس پر یہ راز کھلتا ہے کہ وہ ایک ابدی وجود رکھتا ہے۔ اس کو یہاں مرنے کے بعد پھر جینا بھی ہے۔ اس کے اقوال، اعمال اور عقاید سب ایک ابدی قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے اسے ان کو اسی دنیا کے نفع و ضرر کے محدود پیمانوں سے نہیں ناپنا تولنا چاہیئے بلکہ مرنے کے بعد کی زندگی کو بھی سامنے رکھنا چاہیئے۔ اسے اسی حیات چند روزہ کے لیے نہیں جمع کرنا چاہیئے بلکہ اس کی فکر اس حیات ابدی کے لیے ہونی چاہیئے جو شروع ہو کر کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے۔

حضرات! اس وحی الٰہی کا آخری اور کامل صحیفہ قرآن مجید ہے جس کا نازل کرنے والا اللہ تعالیٰ اور جس کو لانے والے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس وجہ سے آپ کو اپنی روحانی و ایمانی صحت کے لیے اللہ تعالیٰ کی اس کتاب اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ ان سے روشنی حاصل کیے بغیر نہ آپ کی عقل اس عالم فانی کی تنگ نائے سے باہر نکل سکتی نہ آپ کے اخلاق و کردار میں آفاقیت و ابدیت پیدا ہو سکتی۔ آپ کو یاد رکھنا چاہیئے کہ آپ صرف دنیا کی قوموں میں سے ایک قوم نہیں ہیں جس کو جغرافیہ کی حد بندیوں نے پیدا کیا ہو بلکہ آپ خلافت الٰہی کے وارث، خیر امت اور زمین میں خدا کے قانون عدل و قسط کے علم بردار اور گواہ ہیں۔ آپ قوموں کے مقلد یا ان کے حریف نہیں بلکہ اپنے منصب کے لحاظ سے ان کے ہادی و مرشد ہیں۔ آپ کو صرف اپنے ہی لئے نہیں جینا ہے بلکہ اس پوری خدائی کے لیے جینا ہے۔ آپ کی دنیا اسی عالم آب و گل تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ایک نا پیدا کنار عالم، عالم آخرت کا بھی جڑا ہوا ہے اس وجہ سے وہ محدود نگاہ جو ابھی تک چاند و مریخ تک بھی نہ پہنچ سکی، آپ کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ آپ کو دنیا کو عرش کا بھی سراغ دینا ہے۔ اسی طرح وہ کردار جو نسلی و قومی تعصبات کے خمیر سے پیدا ہوتا ہے وہ آپ کے شایانِ شان نہیں ہے بلکہ وہ کردار آپ کا حصہ ہے جس پر صفات الٰہی کا عکس اور نور محمدی کا جمال ہو۔

اسی کتاب و سنت کے تعلق اور فیض سے ہمارے نوجوانوں کے اندر وہ قوت پیدا ہوگی جو علی مرتضیٰ کے اندر تھی۔ ہم مسلمانوں میں بوڑھوں کے لیے نمونہ صدیق اکبرؓ ہیں جن کو ذوشیبتہ

المسلمین (مسلمانوں کے بڑے بوڑھے) کہا جاتا تھا۔ ادھیڑوں کے لیے مثال فاروق اعظمؓ اور عثمانؓ غنی ہیں۔ دونوں غازی، دونوں فاتح، دونوں شہید اور دونوں خدا کی زمین میں خدا کے قانونِ عدل و قسط اور حکومت الٰہیہ کے مظہر۔ اسی طرح نوجوانوں کے لیے مثال اور نمونہ علیؓ مرتضیٰ ہیں، جن کی بابت آپ نے سنا ہوگا کہ لا فتیٰ الا علی لا سیف الا ذوالفقار اور ہاں عزیز طالبات آپ بھی سن لیں کہ آپ کے لیے مثال عائشہ صدیقہ اور فاطمہؓ زہرا ہیں، جن کے علم و عقل کا یہ عالم تھا کہ ان کی روایات اور ان کے اجتہادات پر ہماری فقہ کی بنیادیں استوار ہوئیں اور جن کے زہد و تقویٰ اور طہارت کی شہادت قرآن نے دی۔

عزیز نوجوانو! آپ اپنے اندر یہ قنوت پیدا کیجئے۔ یہ قنوت صرف جسمانی بلوغ، خون کے ہیجان، رگ پٹھوں کی قوت اور مرغن غذاؤں سے نہیں پیدا ہوتی بلکہ ضبط نفس، عقلی صحت اور ایمانی و اخلاقی تندرستی سے پیدا ہوتی ہے۔

ہماری قوم کو آج سب سے زیادہ ضرورت اسی چیز کی ہے۔ ہم آج اپنے ملک میں جن چیزوں کی کمی سے دوچار ہیں یہ ساری کمیاں پوری ہو جائیں گی لیکن جو اخلاقی زوال ہمارے ہر طبقے میں عموماً اور نوجوانوں کے طبقے میں خصوصاً نمایاں ہو رہا ہے یہ وہ مرض ہے جو اگر جڑ پکڑ گیا تو اس کا علاج ناممکن ہوگا۔ ہمارا حاضر جیسا بھی کچھ ہے لیکن مستقبل کا انحصار تمام تر آپ کی صلاحیتوں پر ہے۔ میری دعا ہے کہ میری یہ معروضات آپ کے دل میں گھر کریں۔ آپ اپنے فرض کو پہچانیں اور آپ کے روز و شب، آپ کے اشغال و معمولات اور آپ کے ظاہر و باطن میں وہ تبدیلی نمایاں ہو جو آپ کے دعاگویوں اور آپ سے امیدیں باندھنے والوں کو ایک روشن مستقبل کی بشارت دے۔

---

مولانا داؤد غزنوی مرحوم کی یاد میں صہ سے آگے

خود مولانا یاد آجاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے۔ ان کی فروگذاشتوں سے درگزر کرے اور ان کے درجات کو بلند تر فرمائے — آمین

واقعہ یہ ہے کہ اس دور میں مولانا کی شخصیت بہت غنیمت تھی! اور اس میں اسلام کے قرنِ اوّل کی بہت سی خصوصیات موجود تھیں، خصوصاً اتباع سنت کے مکمل اہتمام کے ساتھ قلب و روح کی حیاتِ باطنی کا جو حسین امتزاج ان کی شخصیت میں پایا جاتا تھا وہ تو اس دور میں جبکہ تصوف میں بہت سی نئی باتیں بطور لوازم داخل ہو گئی ہیں، بہت ہی قابل قدر تھا! اور میری ناچیز رائے میں اس دور میں شدید ترین ضرورت اسی چیز کی ہے ——

یادرفتگاں

اسرار احمد

## مولانا داؤد غزنوی علیہ الرحمۃ کی

# چند یادیں

ذیل کا مضمون ہفت روزہ 'الاعتصام' لاہور کے عید الاضحیٰ نمبر میں شائع ہو چکا ہے۔ لیکن چونکہ اس میں بعض باتیں عمومی دلچسپی کی بھی ہیں لہٰذا قارئین میثاق کی خدمت میں بھی پیش کیا جا رہا ہے ——— مدیر

'الاعتصام' کے عید الاضحیٰ نمبر کے لئے کچھ لکھنے کی فرمائش پر مجھے بے اختیار آج سے ٹھیک پانچ سال پہلے یعنی ۱۳۸۱ھ کے حج کے موقع پر مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور منیٰ و عرفات میں مولانا داؤد غزنوی مرحوم کی رفاقت میں گذارے ہوئے کچھ لمحات یاد آ گئے اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ مولانا مرحوم کے بارے میں اپنے کچھ تاثرات قلمبند کر کے قارئین الاعتصام کی خدمت میں ہدیہ کروں۔

راقم الحروف اگرچہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۴ء تک یعنی مسلسل سات سال بسلسلۂ تعلیم لاہور میں مقیم رہا لیکن ایک مخصوص نقطۂ نظر کے شدید تعصب کے سبب سے صورت حال کچھ ایسی رہی کہ ایک خاص حلقے سے باہر کے کسی صاحب فضل و کمال سے ملاقات کی خواہش کبھی پیدا نہ ہو سکی۔ آج جب یہ خیال آتا ہے کہ اسی لاہور میں مولانا حافظ محمد حسن صاحب، مولانا احمد علی صاحب اور مولانا داؤد غزنوی علیہم الرحمہ جیسی شخصیتیں موجود تھیں جن کی پُر تاثیر صحبت سے استفادہ کیا جا سکتا تھا لیکن نہ کیا گیا تو شدید محرومی کا احساس ہوتا ہے۔ اور اسمیں مزید تلخی اس مشاہدے سے پیدا ہوتی ہے کہ غالب کے اس قول کے مطابق کہ ع:

"دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں!"

آج کا لاہور ان تینوں بزرگوں سے محروم ہو جانے کی بنا پر واقعتہً ویران نظر آتا ہے۔

اور اب اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ صورت کب پیدا ہو کہ ع:

"کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد!"

---

تعلیم سے فراغت کے بعد جب منٹگمری (حال ساہیوال) میں اقامت پذیر ہوا تو کچھ ہی عرصے

بعد بعض وجوہات کی بنا پر دل و دماغ پر اس مخصوص نقطۂ نظر کی گرفت ڈھیلی پڑنی شروع ہوئی اور نگاہیں اس خاص حلقے سے باہر کے لوگوں کی جانب بھی متوجہ ہوئیں۔ اتفاق سے ان ہی دنوں منٹگمری میں ایک بڑی اہلحدیث کانفرنس مولانا عبدالجلیل صاحب کی وسیع و عریض مسجد میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں پہلی بار مولانا داؤد غزنویؒ کو دیکھنے کا موقع ملا اور نہ معلوم کیوں محض رویت ہی سے دل ان کی جانب کھنچتا سا محسوس ہوا۔ مولانا نے اس موقع پر جمعہ کا خطبہ ارشاد فرمایا میرے دل نے اس خطبے سے گہرا تاثر قبول کیا اور میرے دماغ پر اس کا ایسا پختہ نقش ثبت ہوا کہ آج کم و بیش گیارہ سال گذر جانے کے بعد بھی کیفیت یہ ہے کہ جیسے میں مولانا کو خطبہ دیتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔

میرے لئے اس خطبے کی سب سے زیادہ مؤثر چیز وہ بلا کا سوز اور انتہا کا درد تھا جو اس کے ایک ایک لفظ میں رچا اور بسا ہوا تھا۔ تقریر کے دوران مولانا کی آنکھوں میں نمی تواتر ابتداتا انتہا رہی لیکن دو ایک بار تو فرط رقت سے جذبات بالکل ہی بے قابو ہو گئے۔ خصوصاً مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان صحابیؓ کا تذکرہ کرتے ہوئے جنہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ "میں جنت میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں" اور جن کے جواب میں حضورؐ نے ارشاد فرمایا تھا کہ اطمینان رکھو اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ "مولانا نے یہ کہہ کر بے اختیار زار و قطار رونا شروع کر دیا تھا کہ "ہائے افسوس انہیں (صحابہؓ کو) کن باتوں کی خواہش و تمنا تھی اور ہم کن خواہشات کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ !!"

راقم الحروف کا اس سے پہلے کا عام مشاہدہ چونکہ یہ تھا کہ عام واعظین و ناصحین عموماً اور اہل حدیث علماء خصوصاً سوز و درد کی دولت سے تہی دامن ہوتے ہیں اور اس کے برعکس ان کی تقریر دل پر غلظت اور خشونت کا غلبہ ہوتا ہے لہٰذا اس کے لئے یہ ایک بالکل خلاف توقع بات تھی، بعد میں جوں جوں روابط استوار ہوئے اور مولانا کو مزید قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ معلوم ہوا کہ رقت اور سوز مولانا کی طبیعت کا مستقل جزو بن گئے تھے اور تواضع و انکساری کا نخت شدید غلبہ رہتا تھا اور اس کے باوجود کہ اپنے مسلک کے معاملے میں ادنیٰ درجے میں بھی مداہنت گوارا نہ تھی۔ لیکن قلب انتہائی فراخ تھا اور خیر اور خوبی جہاں اور جتنی نظر آتی تھی کھلے دل کے ساتھ اس کا اعتراف فرماتے تھے (وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی) اور اس معاملے میں چھوٹے بڑے کی کوئی تمیز ان کی راہ میں حائل نہ ہوتی تھی۔

ایک انتہائی تلخ احساس جو مولانا پر ہر وقت طاری رہتا تھا اور جس کا بار بار اظہار ہوتا تھا

وہ یہ تھا کہ زندگی کا بیشتر حصہ ایسی سرگرمیوں کی نذر ہوگیا جن میں 'خارج' کی مصروفیات کے غلبے نے 'باطن' کی جانب اتنا متوجہ نہ ہونے دیا جتنا ہونا چاہیئے تھا اور اپنے احساس کے مطابق اس میدان میں مولانا اپنے عظیم اسلاف کی روایات کو برقرار نہ رکھ سکے۔ اس خیال کا اظہار مولانا اکثر انتہائی حسرت کے ساتھ کیا کرتے تھے اور بسا اوقات اس تذکرے میں ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے شروع ہو جاتے تھے۔ خاص طور پر مسجد نبوی میں میں نے مولانا پر اس حسرت کی وجہ سے جو رقت طاری دیکھی وہ میں کسی طرح نہیں بھول سکتا۔

---

منٹگمری کے خطبۂ جمعہ میں ایک انتہائی اہم بات جو مولانا نے فرمائی (اور جس کے مخاطب تمام اہل حدیث حضرات کو خصوصی طور پر متوجہ ہونا چاہیئے) وہ یہ تھی کہ "اگرچہ ہم ائمہ اربعہ سے اختلاف کرتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہم ان کی عزت نہیں کرتے یا ان کی قدر و منزلت سے آگاہ نہیں ہیں۔ خدا شاہد ہے کہ ہمارے دلوں میں ان کا اسی قدر احترام موجود ہے جس قدر ان کے مقلدین کے دلوں میں ہے، لیکن ہم ان سے اختلاف کرنے پر مجبور اس لئے ہو جاتے ہیں کہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر و منزلت ہمارے دلوں میں ان کے اقوال سے بہر حال زیادہ ہے۔"

اس سلسلے میں مولانا نے سامعین (جو اکثر و بیشتر اہلحدیث تھے) کو سخت الفاظ میں تنبیہہ کی کہ "دوسرے لوگوں کی یہ شکایت کہ اہل حدیث حضرات ائمہ اربعہ کی توہین کرتے ہیں بلاوجہ نہیں ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ ہمارے حلقے میں عوام اس گمراہی میں مبتلا ہو رہے ہیں اور ائمہ اربعہ کے اقوال کا تذکرہ حقارت کے ساتھ بھی کر جاتے ہیں۔ یہ رجحان سخت گمراہ کن اور خطرناک ہے اور ہمیں سختی کے ساتھ اس کو روکنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔"

اس ضمن میں مولانا نے فرمایا کہ "حضرت محی الدین ابن عربی کے نظریۂ وحدت وجود پر سب سے سخت تنقید حضرت مجدد الف ثانیؒ نے فرمائی اور شدید ترین اختلاف کا اظہار کیا۔ لیکن اس کے باوجود ان کا ادب و احترام جس درجہ انہوں نے ملحوظ رکھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مکتوبات میں ایک مقام پر آپ تحریر فرماتے ہیں کہ 'من زلہ برادر خوان ایشانم۔ لیکن چہ کنم؟ معاملہ صفات باری تعالیٰ است۔' اسی طرح ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم ان ائمہ دین کے دسترخوان کے جھوٹے ٹکڑے کھانے والے ہیں لیکن کیا کریں جب معاملہ حدیث رسولؐ کا آجاتا ہے تو ہم

مجبور ہو جاتے ہیں کہ ان کے قول کو چھوڑ کر حدیث رسولؐ پر عمل کریں "

راقم الحروف کے لئے اوّل تو یہ فراخی قلب ہی بہت غیر متوقع تھی کہ جمعیت اہل حدیث کے صدر اپنی جمعیت کے لوگوں کو ائمہ اربعہ کی تعظیم و تکریم کی اس درجہ شدت کے ساتھ تلقین کریں۔ لیکن شیخ محی الدین ابن عربی کے ساتھ حضرت کا تعظیم آمیز کلمہ تو بہت ہی حیرانی کا موجب ہوا۔ چنانچہ جمعہ کے بعد جب ایک جگہ کھانے پر ملاقات ہوئی تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے عرض کر ہی دیا کہ "حضرت! آپ نے ابن عربی کا تذکرہ تعظیم و تکریم کے ساتھ کیا حالانکہ امام ابن تیمیہؒ کی رائے ان کے بارے میں بہت سخت ہے " اس کا جو جواب مولانا مرحوم نے دیا وہ اس قابل ہے کہ سنہری حروف سے لکھا جائے اور دین کے تمام خادم اس کو حرز جان بنالیں۔ میری بات سن کر مولانا نے قدرے توقف کے بعد فرمایا " ڈاکٹر صاحب! ابن تیمیہ اور ابن عربی دونوں ہی ہمارے بزرگ ہیں۔ اپنے آپس کے اختلاف کو وہ جانیں! ہم خرد ہیں اور خرد رہنے ہی میں عافیت سمجھتے ہیں۔" مولانا نے یہ الفاظ اتنے شدید تاثر کے ساتھ فرمائے کہ ساتھ ہی ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے! واقعہ یہ ہے کہ میں عرض نہیں کر سکتا کہ مولانا کے اس منکسرانہ قول سے میرے دل میں ان کی عزت میں ایکدم کس قدر اضافہ ہوا اور ان کا احترام کتنا بڑھ گیا!!

کاش کہ ہماری تمام دینی جماعتوں کے رہنما اور فرقوں کے پیشوا فراخی قلب کی اس نعمت سے بہرہ ور ہو جائیں اور "اعجاب المرء بنفسہ" اور "اعجاب کل ذی رای برایہ" کے مہلک امراض سے شفایاب ہو کر تواضع اور انکساری کو اپنا شعار بنالیں اور اپنے اپنے مسلک پر سختی سے عمل پیرا ہونے کے باوجود دوسروں کے اکرام و تکریم کی اس روش کو اختیار کر لیں تو تلخیاں ختم ہو کر رہ جائیں اور صرف وہ اختلاف باقی رہ جائے جسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے حق میں رحمت قرار دیا ہے!!

---

ایک مختصر سے خطبے اور ایک چھوٹی سی ملاقات سے دل و دماغ نے اس قدر اثر لیا کہ اس کے بعد جب بھی کبھی لاہور آنا ہوا مولانا کی خدمت میں حاضری ضروری خود مولانا مرحوم کو بھی — راقم الحروف سے ایک خصوصی تعلق خاطر قائم ہو گیا تھا اور وہ مجھ پر شفقت فرمانے لگے تھے —! چنانچہ ایک بار جب میں نے مولانا سے مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی کی جلد اول عاریۃً

مانگی تو مولانا نے فرمایا " ڈاکٹر صاحب ! اس کتاب کو میں نے آج تک کبھی اپنے سے جُدا نہ کیا اور میں کسی دوسرے شخص کو یہ کتاب عاریتہً نہ دیتا لیکن آپ سے ایک خصوصی محبت ہو گئی ہے جس کی بنا پر انکار نہیں کر سکتا " چنانچہ ایک ماہ کے لئے میں وہ نسخہ منٹگمری لے گیا پھر جب میں اسے واپس لایا تو اس پر نئی چرمی جلد بندھوا لایا جسے دیکھ کر مولانا بہت خوش ہوئے اور فرمانے لگے " میرا پہلے ہی سے یہ اندازہ تھا کہ آپ اس کتاب کے واقعی قدردان ہیں ! "

۱۹۶۲ء میں والدین کے ہمراہ حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی تو مکہ مکرمہ پہنچنے پر معلوم ہوا کہ مولانا بھی رابطہ عالم اسلامی کے تاسیسی اجلاس میں شرکت کی دعوت پر تشریف لائے ہوئے ہیں۔ چنانچہ فوراً فندق مصر حاضر ہو کر ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ مولانا بھی مجھے وہاں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ دوسرے ہی روز رابطہ کا پہلا اجلاس تھا۔ مولانا نے فرمایا کہ تم اس میں میرے ساتھ میرے سیکرٹری کی حیثیت سے شرکت کرو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور میں رابطہ کی دو نشستوں میں شریک ہوا جن میں سے ایک میں ملک سعود ابن عبدالعزیز نے خطاب فرمایا۔ اس اجلاس کی روداد ایک علیحدہ موضوع ہے۔ یہاں صرف اس قدر ذکر مناسب ہے کہ تقریر سے قبل شاہ سعود سے مختلف شرکاء کا تعارف کرایا گیا تو میں نے دیکھا کہ مولانا سے ملتے ہوئے شاہ کے چہرے پر عقیدت و احترام کی ایک جھلک نمودار ہوئی جو خاندان غزنویہ کے ساتھ آل سعود کے قدیم قلبی تعلق کی آئینہ دار تھی۔

منیٰ میں قیام کے دوران بھی متعدد بار مولانا سے ملاقات کا موقع ملا۔ مولانا کی بڑی صاحبزادی جو اس مبارک سفر میں ساتھ تھیں منیٰ میں علیل ہو گئیں۔ میری تشخیص کے مطابق ٹائیفائڈ کا حملہ تھا۔ چنانچہ علاج بھی میں نے ہی کیا اور سرکاری ہسپتال سے ادویہ بھی میں ہی حاصل کرتا رہا مولانا اس سلسلے میں ایک ایک قدم پر از راہ شفقت تشکر و امتنان کا اظہار فرماتے رہے۔ ادھر میں اُن کی اس خدمت کی توفیق پانے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا رہا۔ عرفات سے واپسی پر مولانا کی اپنی طبیعت بھی ناساز ہو گئی تھی۔ چنانچہ ان کی جانب سے قربانی بھی میں نے ہی کی۔

قیام منیٰ کا ایک واقعہ جو اگرچہ براہ راست مولانا کی ذات سے متعلق تو نہیں ہے تاہم بہت سبق آموز ہے، عرض کرتا ہوں۔

میرے ایک عزیز جو ایک طویل عرصہ سے سعودی عرب ہی میں مقیم ہیں اور مسلکاً اہلحدیث

ہیں مولانا کے جانب سے قدرے سوء ظن میں مبتلا تھے اور حافظ عبداللہ صاحب روپڑی مرحوم سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔ میں نے مکہ مکرمہ کے قیام کے دوران ان سے متعدد بار کہا کہ چلئے میں آپ کو مولانا سے ملواؤں لیکن وہ ٹال جاتے رہے! منیٰ میں ان سے اتفاقاً ملاقات ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ چلو قریب ہی شیخ المعلمین کی منزل میں حافظ عبداللہ صاحب روپڑی تشریف فرما ہیں ان سے ملاقات کراؤں۔ مجھے کیا عذر ہوسکتا تھا ان کے ساتھ حافظ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔

حافظ صاحب مرحوم کے اردگرد اس وقت پچاس ساٹھ افراد کا مجمع تھا اور حافظ صاحب خود تو خاموش بیٹھے تھے لیکن ادھیڑ عمر کے ایک صاحب پاکستان میں جماعت اہلحدیث کے آپس کے اختلافات اور مولانا داؤد غزنوی مرحوم سے اپنی شکایات کا تذکرہ کر رہے تھے۔ میں کچھ دیر تو صبر کے ساتھ سنتا رہا لیکن پھر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے قدرے درشتی کے ساتھ عرض کیا۔ "حضرت! آپ یہاں پاکستان سے دو اڑھائی ہزار میل دور ایک مقدس مقام پر تشریف رکھتے ہیں کیا اس جگہ بھی یہ ممکن نہیں کہ وہاں کے اختلافات کو بھلا کر باہمی اتحاد اور اعتماد کی فضا پیدا کی جا سکے؟" میرے اس طرح اچانک توجہ دلانے پر مجمع سناٹے میں آگیا اور سب لوگ حافظ صاحب مرحوم کی طرف دیکھنے لگے۔ لیکن خدا رحمت نازل فرمائے ان کی روح پر کہ انہوں نے میری مکمل تائید کی اور حکم دیا کہ ان معاملات کا تذکرہ دوران حج نہ کیا جائے ساتھ ہی گفتگو کا رخ موڑ کر کچھ وعظ و نصیحت کا سلسلہ شروع فرما دیا!

مدینہ منورہ میں مولانا کی صحت زیادہ خراب ہوگئی تھی اور دل کا دورہ پڑ گیا تھا۔ لہٰذا کچھ نمازیں بھی مولانا نے مجبوراً اپنی قیام گاہ ہی پر ادا فرمائیں۔ لیکن مسجد نبوی کی جماعت سے محرومی پر شدید رنج اور افسوس مولانا کو ہوتا تھا اور جب بھی طبیعت ذرا سنبھلتی تھی مولانا ضرور مسجد نبوی میں حاضر ہو کر جماعت کے ساتھ نماز ادا فرماتے تھے۔

ایک مرتبہ مسجد نبوی میں مغرب کی نماز کے لئے میں مولانا کے بالکل ساتھ ان کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا ہوا اور اپنی پرانی عادت کی بنا پر میں نے تکبیر تحریمہ سے قبل ہی بطور نیت، "انی وجہت وجھی ........ الخ" پڑھا۔ تو مولانا نے فوری طور پر تصحیح کی اور فرمایا کہ یہ دعا تکبیر تحریمہ کے بعد پڑھا کرو۔ چنانچہ اسی وقت سے میرا معمول بدل گیا اور اب اکثر ایسا ہوتا ہے کہ نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہوں تو مولانا کی یہ نصیحت اور اس کے ضمن میں (بقیہ بر صفحہ ۶۳)

بقیہ تذکرہ و تبصرہ کا صفحہ ۵ سے آگے

کے ساتھ علمائے دین بھی قومی قیادت کے حریف بن گئے اور رفتہ رفتہ برسر اقتدار طبقہ، اور رجال دین، دو مخالف و معاند گروہوں کی صورت اختیار کرتے چلے گئے — اور دوسرے یہ کہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کو جدت پسندی اور از سر تا پیر متحرک متجددیت — اور قدامت پرستی اور سراپا جامد مذہبیت کے مابین ایک 'امتہ وسطیٰ' کی پوزیشن کو ترک کر کے کلیتہً قدامت پرستی اختیار کرنی پڑی اور اگرچہ اس کی بنا پر بہت سے دلچسپ تضادات ظہور میں آئے مثلاً یہ کہ اس شخص کو جو تنہا اپنی ذات پر فقہ حنفی، کو پوری طرح نافذ کرنے کو تیار نہ تھا بلکہ اس میں اپنا 'اقول' لگانا ضروری خیال کرتا تھا۔ یہ موقف اختیار کرنا پڑا کہ دس گیارہ کروڑ افراد کی ایک پوری قوم پر صدیوں پہلے کی مرتب شدہ فقہ حنفی کو جوں کا توں نافذ کر دیا جائے[1] — لیکن مولانا پر جلد از جلد مسند حکومت پر پہنچ کر 'قوم' اور 'مذہب' دونوں کو 'سنبھالنے' کا جو خبط سوار ہو گیا تھا اس کے پیش نظر یہ قربانیاں بہر حال بہت حقیر تھیں ع ہم نے کیا کیا نہ کیا دیدہ و دل کی خاطر! (جاری)

(۲)

تقریباً دو ماہ قبل جو پانچ علماء نظر بند کئے گئے تھے، وہ رہا ہو گئے — قطع نظر اس سے کہ حکومت نے رہائی کے یہ احکام از خود جاری کئے یا علماء کے اس وفد کی گفتگو سے متاثر ہو کر جو ایک روز قبل ہی صدر مملکت سے ملا تھا، یا اس رٹ سے خائف ہو کر جو عدالت عالیہ میں مولانا مودودی کی نظر بندی کے خلاف زیر سماعت تھی — ہم اس اقدام کا خیر مقدم کرتے ہیں ہمارے نزدیک یہ نظر بندی کسی اعتبار سے بھی نہ جائز تھی نہ مبنی بر مصلحت، اور اس سے سوائے اس کے اور کچھ حاصل نہ ہوا کہ حکومت اور علماء کے مابین تلخی میں اضافہ ہوا اور عوام کے دلوں میں یہ احساس مزید جڑ پکڑ گیا کہ حکومت ان کے دین کے معاملے میں مداخلت کرنا چاہتی ہے! اس مسئلے پر ہم نے 'میثاق' کی گذشتہ اشاعت میں جو اظہار خیال کیا تھا اس پر ہمیں اپنے

---

[1] اسی سلسلے کا ایک دلچسپ لطیفہ مولانا داؤد غزنوی مرحوم نے سنایا۔ کہ ایک موقع پر علماء کے ایک مشترکہ بیان پر مولانا مودودی نے ان سے بھی دستخط کرانے چاہے جس کی ایک شق یہ بھی تھی کہ ملک میں فقہ حنفی رائج کی جائے۔ مولانا داؤد غزنوی مرحوم نے فرمایا کہ: "اس پر میں نے مولانا کی خدمت میں عرض کیا کہ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ اپنے قتل کے حکم نامے پر میں خود دستخط کر دوں؟"

بعض انتہائی مخلص دوستوں کی جانب سے اس شکایت کے خطوط موصول ہوئے ہیں کہ ہم نے علماء کے ساتھ زیادتی کی ہے ـــــ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں علماء کرام کا پورا احترام ملحوظ ہے اور دین جتنا کچھ اور جیسا کچھ بھی موجود ہے اسے ہم ان حضرات ہی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ سمجھتے ہیں ـــــ لیکن ہمیں یہ نظر آرہا ہے کہ بعض خالص سیاسی ذہن کے لوگ علماء کے ایک طبقے کو جس انداز سے ملکی سیاست کے میدان میں گھسیٹ رہے ہیں وہ خود اسلام اور اس ملک میں اس کے مستقبل کے اعتبار سے انتہائی مضر ہے! ـــــ حال ہی میں ان پانچ علماء کی رہائی کی خوشی میں 'لاہور کے شہریوں' کی جانب سے جو دعوتِ استقبالیہ پارک لگژری ہوٹل میں منعقد ہوئی اس کے شرکاء کی فہرست سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ اپوزیشن کا کوئی کنونشن تھا جس میں اپوزیشن کی تمام جماعتوں کے سرکردہ اور سربرآوردہ لوگ موجود تھے۔ اس سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ معاملہ کیا رخ اختیار کر رہا ہے ـــــ ہماری رائے میں سیاسی میدان میں حزبِ مخالف کا وجود جائز ہی نہیں ضروری اور لازمی ہے اور کسی مستحکم بنیاد پر عوام کی سیاسی تنظیم وقت کی ایک اہم ضرورت ہے لیکن بحالاتِ موجودہ مذہبی و دینی معاملات کو سیاسی میدان میں لانے سے بعض سیاسی عناصر کو تو ضرور فائدہ پہنچ سکتا ہے (اگرچہ وہ بھی بالکل فوری اور عارضی طور پر!) لیکن دین کے لئے انتہائی خطرناک ہے ـــــ لہٰذا ہم علماء کرام کی خدمت میں یہ گذارش کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ وہ اس معاملے پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور ایسی ہر صورت سے حتی الامکان گریز کریں جس سے خواہ مخواہ تصادم پیدا ہو اور فائدہ نہ ملک و ملت کو پہنچے نہ دین و مذہب کو ـــــ!

ہمیں افسوس ہے کہ بعض وجوہات کی بنا پر 'نقضِ غزل' کی قسط نہ گزشتہ شمارے میں شائع ہوسکی اور نہ ہی ـــــ شمارہ زیرِ نظر میں شاملِ اشاعت ہوسکی ـــــ

ـــــ ادارہ

# ایک اہم اعلان

میثاق کے پرانے پرچوں کا جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ اتفاق سے جنوری ۶۵ء سے فروری ۶۶ء تک جتنی اشاعتیں شائع ہوئی ہیں ان سب کی ایک محدود تعداد تسلسل کے ساتھ دفتر میں موجود ہے

ان میں

**مکمل مقدمہ تدبر قرآن (اور)**

**پوری تفسیر سورۃ آل عمران کے علاوہ**

مندرجہ ذیل مضامین ـــــــ شائع ہوئے ہیں

## افاداتِ فراہیؒ

* ملکوت الٰہی * عقیدہ شفاعت * نفس میں گناہوں کا سرچشمہ اور * مصائب و تکالیف کا سرچشمہ۔

**مقالات مولانا ضیاء الدین اصلاحی**

* قرآن کی اثر انگیزی * قرآن و حدیث کی باہمی نوعیت
رسول اللہ صلعم کا منصب * خبر احاد کی حجیت۔

تذکرہ و تبصرہ میں مولانا امین احسن اصلاحی کے قلم سے

۶۵ء کے صدارتی انتخابات کے نتائج پر تبصرہ۔ جماعت اسلامی ہند سے گلہ۔ ابو صالح مرحوم کی یاد میں۔ ہندوستان سے سترہ روزہ جنگ پر تبصرہ۔ "میثاق کا اولین اداریہ" دین کا کام کرنے والوں کو مشورے۔

ـــ جناب خالد مسعود کے ـــ

لندن سے دو خطوط اور زکوٰۃ پر مقالے کی پانچ اقساط

... جناب کوثر نیازی کا ...

استعفیٰ از رکنیت جماعت اسلامی اور اسی سلسلے میں مولانا مودودی سے مراسلت

---

## ڈاکٹر اسرار احمد کے قلم سے

"تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ" پر تبصروں کا جائزہ * اسی سلسلے کے مضمون "نقض غزل" کی پانچ اقساط میں جائزہ کمیٹی سے ماچھی گوٹھ تک کے واقعات کا تذکرہ

اسی ضمن میں چوہدری محمد اکبر صاحب کے مکتوب کا جواب

حقیقت زندگی ----- اور

نجات کی راہ: سورہ والعصر کی روشنی میں

ان چودہ اشاعتوں کی مجموعی قیمت آٹھ روپے ستر پیسے بنتی ہے۔ لیکن انہیں تین چوتھائی قیمت پر یعنی ساڑھے چھ روپے میں حاصل کیا جا سکتا ہے۔

لاہور سے باہر کے حضرات اس کے علاوہ اسی پیسے محصول ڈاک یعنی کل سات روپے تیس پیسے بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں یا بذریعہ وی پی پی طلب کریں

جو حضرات اس کے ساتھ ہی

## "تحریک جماعت اسلامی"

ایک تحقیقی مطالعہ

اور

## "تفسیر آیت بسم اللہ و سورہ فاتحہ"

بھی طلب فرمائیں انہیں یہ کتابیں بھی تین چوتھائی قیمت پر ارسال کی جائیں گی۔ نوٹ:- یہ رعایت صرف ان سب کو اکٹھے طلب فرمانے کی صورت میں ہو گی۔

## دار الاشاعت الاسلامیہ

امرت روڈ، کرشن نگر، لاہور ۱

ہم سے طلب فرمائیے

---

★

تصانیف

مولانا امین احسن اصلاحی

★

## تفسیر آیت بسم اللہ و سورۂ فاتحہ

بڑا سائز ، صفحات : ۳۶
ہدیہ : ۷۵ پیسے

★

دعوت دین اور اس کا طریق کار

صفحات: ۳۱۲ ، قیمت : ۳۷۵ روپے

★

تزکیہ نفس

صفحات: ۳۴۴ ، قیمت : ۶۰۰ روپے

★

اسلامی قانون کی تدوین

صفحات : ۱۶۰ ، قیمت : ۳ روپے
سستا ایڈیشن : ۲ روپے

★

عائلی کمیشن رپورٹ پر تبصرہ

صفحات : ۱۲۸ ، قیمت : ۲۲۵ روپے

★

تصانیف

مولانا حمیدالدین فراہی رح

★

مفردات القرآن

قیمت : ۱۴۰ روپے

★

جمہرۃ البلاغہ

قیمت : ۱۵۰ روپے

★

اسباق النحو

حصہ اول : ۱۴۰ روپے
حصہ دوم : ۱۰۰ روپے

★

امثال

آصف الحکیم

قیمت : ۱۳۷ روپے

---

## تحریک جماعت اسلامی

### ایک تحقیقی مطالعہ

تالیف

ڈاکٹر اسرار احمد - ایم اے - ایم بی بی ایس

سابق ناظم اعلیٰ اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان و امیر جماعت اسلامی منٹگمری

★ ضخامت - ۲۳۶ صفحات ★ سائز بڑا ★ طباعت آفسٹ ★ مجلد مع گردپوش

★ قیمت - ۴ روپے علاوہ محصول ڈاک

Regd. No. L. 7360.

Monthly "MEESAAQ" Lahore

Vol. 13 | APRIL 1967 | No. 4

## "گاہے گاہے باز خواں ....."

"..... آپ کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سے یہ مطالبہ نہیں کیا ہے کہ ہم ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی حکومت کی طرح ایک حکومت قائم کر دیں ۔ نہ بندوں کو اس بات کی طاقت حاصل ہے نہ خدا نے اس کی تکلیف دی ہے ۔ البتہ یہ مطالبہ ہم سے کیا گیا ہے کہ ہم اقامت دین کے لئے جدوجہد کریں اور اس جد و جہد میں اپنا تمام سرمایۂ زندگی لگادیں ۔ جان بھی اور مال بھی اور اپنی تمام مرغوبات و محبوبات بھی ۔ اور دین سے مراد اجزائے دین میں سے کوئی جز مراد نہیں ہے خواہ وہ کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو بلکہ دین بحیثیت مجموعی مراد ہے ۔ اس کے کلیات بھی اور جزئیات بھی ، عقائد بھی اور اعمال بھی ، یہ جد و جہد پورے جوش کے ساتھ مطلوب ہے اور اللہ کے نزدیک یہی چیز ہمارے ایمان اور نفاق کی کسوٹی ہے ۔ کوئی سینہ جو اس ولولہ سے خالی ہو ایمان کا مسکن نہیں بن سکتا اور کوئی دل جو اس درد سے نا آشنا ہو خدا کا گھر نہیں ہو سکتا ۔ کتنی ہی تسبیحیں گر دانی جائیں ، کتنے ہی وظیفے پڑھے جائیں اور کتنی ہی ضربیں لگائی جائیں اس عشق کے بدل نہیں ہو سکتے ۔ ساری دینداری کی روح یہی ہے ۔ اور خدا کے ہاں دلوں کے اندر سب سے پہلے یہی چیز ڈھونڈی جائے گی ۔ اور یہ بھی ایک ضروری شرط ہے کہ یہ جد و جہد جماعتی شکل میں ہو ، انفرادی شکل میں نہ ہو ۔ ہر مرد حق کا فرض ہے کہ وہ پہلے اپنے اندر اس کی گرمی پیدا کرے اور پھر یہ کوشش کرے کہ اس آگ سے سارے دل بھڑک اٹھیں ۔ یہ سوال بحث سے خارج ہے کہ یہ جد و جہد کس نتیجہ تک منتہی ہوگی ۔ ہو سکتا ہے کہ ہم آروں سے چیر ڈالے جائیں ، گلیوں میں گھسیٹے جائیں ، انگاروں پر لٹائے جائیں اور ہمارے جسموں کو چیل اور کوے نوچیں اور ان ساری باتوں کے بعد بھی ہمیں یہ سعادت حاصل نہ ہوسکے کہ ہم موجودہ نظام باطل کو ایک نظام حق سے بدل دیں لیکن نہ تو یہ ناکامی ناکامی ہے اور نہ اس کا اندیشہ بلکہ اس کا یقین بھی ، ہم کو اس مطالبہ سے سبکدوش کر سکتا ہے جو خدا نے اقامت دین کے لئے ہم سے کیا ہے ۔ وہ ایک قطعی اوراٹل فرض ہے جو ہر قیمت پر اور ہر حال میں ہمیں ادا کرنا ہے ....."

امین احسن اصلاحی

———

اقتباس "چراغ راہ" مئی ۱۹۵۳ء مرسلہ محمد اسحاق جلالپوری (منڈی بہاءالدین)

محی الدین پبلشر نے باہتمام محمد طفیل مالک نقوش پریس اردو بازار لاہور سے چھپوا کر دارالاشاعت الاسلامیہ ، امرت روڈ ، کرشن نگر، لاہور-۱ سے شائع کیا ۔